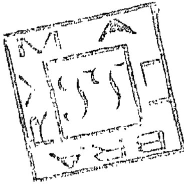
1586

انجمن اُردو "لکھنؤ"



فیضِ میر



مُصنفہ

سلطان الشعرا حضرت میر محمد تقی میر

مرتبہ

سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔ اے

باہتمام محمد جواد مالک و مہتمم مطبع

در نظامی پریس وکٹوریہ سٹریٹ لکھنؤ طبع گردید





محبت محترم جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صاحب کی خدمت میں
ناچیز ہدیۂ اخلاص
سید مسعود حسن رضوی
۱۱ ستمبر ۱۹۵۷ع

مقدمہ

اُردو انشا پردازی کے صدرِ مجلس اور ادبی و لسانی تحقیق کے خضرِ طریقت حضرت آزاد مغفور نے اپنی غیر فانی کتاب "آبِ حیات" میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ اور اُن کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ اُن کے اکثر بیانوں کا من گھڑت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جس نے آزاد پر بیجا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن دُوربین نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہے۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہے اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دُھن پیدا ہو چلی ہے۔ یہ ذوق ذرا اور پختہ، اور یہ دُھن کچھ اور پکی ہو جائے، اور تحقیق کے راستے کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے تو یہ عارضی آزاد بیزاری بے شبہ آزاد پرستی میں تبدیل ہو جائیگی۔ اِس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزاد ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ اُن سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔

آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی اور پھیلائی جارہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دُور یا ہمارے علم سے باہر ہے اسکو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں۔ لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق

سمجھتے ہیں ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ انشا پردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصے میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہیے۔ آزاد کی تحقیق اور انشا پردازی پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل تو نہیں ہے لیکن

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں انھیں کی تصانیف میں آزاد نے رسالۂ "فیض میر" کو بھی شمار کیا ہے جس وقت تک یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اس وقت تک وہ آزاد کا تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اب دیکھیے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی طرح ادبی تحقیق جتنی بڑھتی جائیگی آزاد کے افسانے حقیقت بنتے جائیں گے۔

آزاد نے ہم کو بہت سی راہیں پہلے پہل دکھائی ہیں اور بہت سی کہانیاں پہلے پہل سنائی ہیں۔ اگرچہ بہت سی باتیں آزاد نے ایسی کتابوں سے لی ہیں جو طاق نسیاں کے نقش و نگار ہو گئیں یا جن کا ایک آدھ بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دنیا کے کسی گوشے میں پڑا ہوا ہے۔ تاہم چونکہ ان کو منظر عام پر لانے کا سہرا حضرت آزاد کے سر ہے لہذا ان باتوں کے علم کے لیے بھی ہم آزاد ہی کے منت گزار ہیں۔

"فیض میر" کا نام بھی انھیں کی بدولت ہم تک پہونچا مگر آزاد نے اس رسالے کا فقط نام ہی لکھا ہے۔ غالباً یہ رسالہ انکی نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ وہ اسکے موضوع وغیرہ کا کچھ ذکر ضرور کرتے۔

فیض میر کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ البتہ محسن نے میر کی تصنیفوں کی فہرست ان لفظوں میں دی ہے:۔

"چھ دیوان ہندی مع قصائد و مثنوی، ایک دیوان فارسی۔ ایک تذکرہ۔

سلہ آب حیات صفحہ ۲۰۷

ایک رسالہ "میر فیض" ان سے یادگار ہے[۵۱]۔

مؤلف تذکرہ کے قلم کی لغزش ہو یا کاتب کی اصلاح لیکن اس میں شک نہیں کہ میر فیض سے وہی رسالہ مراد ہے جس کا صحیح نام آزاد نے "فیض میر" بتایا ہے۔

ایک زمانہ ہوا کہ اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست میں میں نے ذکر میر کا نام دیکھا[۵۲] حضرت میر کی خود نوشتہ سوانح عمری کی زیارت کے لئے دل بے چین ہو گیا میں اُن دنوں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں "ذکر میر" کو ڈھونڈتی تھیں لیکن اسکا پتا کہیں نہ لگتا تھا۔ طلب صادق کی کشش دیکھیے کہ ایک مدت کے بعد مجھے میر کی غیر مطبوعہ اور نہایت کمیاب تصنیفوں کا ایک مجموعہ ہاتھ آ گیا۔ اُس مجموعے میں "ذکر میر" بھی تھی۔ میر کا فارسی دیوان بھی تھا۔ اور رسالہ "فیض میر" بھی تھا۔ اس گنج باد آورد کے ملتے ہی مجھے خیال ہوا کہ جس گلدستے سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کی ہیں اُس سے ارباب ذوق کی نگاہوں کی بھی ضیافت کردوں۔ "ذکر میر" کی اشاعت طے ہو گئی۔ کاتب تلاش کیا گیا۔ مقدمہ لکھنے کا سامان ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کتاب کی نقل بھی ختم کے قریب پہونچی لیکن اس کی اشاعت کی سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔ یکایک رسالہ "اُردو" نے خبر دی کہ انجمن ترقی اُردو عنقریب "ذکر میر" کو شائع کرنے والی ہے[۵۳]۔ غرض کہ میری یہ محنت رائگاں ہوئی اور دل کی ایک اُمنگ بجھ کر رہ گئی۔ مگر میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ کسی کام کو شروع تو میں نے کیا لیکن ختم کسی اور نے کر دیا۔ بہرحال "ذکر میر" شائع ہو گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو قلم اُردو نظم کے میدان میں کوثر اور سلسبیل بہاتا تھا وہ فارسی نثر میں بھی کیا کیا گلکاریاں کرتا ہے۔ "نکات الشعرا" نے میر کی فارسی انشا پردازی کی سند میں جو محضر

---

[۵۱] تذکرہ سراپا سخن صفحہ ۲۶۔ [۵۲] فہرست کتبخانہائے اودھ مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر صفحہ ۱۲۷ نمبر ۹۷

[۵۳] رسالہ "اُردو" بابت اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

پیش کیا تھا اس پر "ذکرِ میر" نے ایک مُہر اور لگا دی۔

"ذکرِ میر" کی اشاعت گو میرے ہاتھوں نہیں ہوئی لیکن میرا مقصد تو ایک حد تک پورا ہو ہی گیا۔ اب میر کی بقیہ غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کی فکر تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ "فیضِ میر" کی اشاعت کا وقت بھی آ گیا میر کی جتنی تصنیفوں کا پتا لگ چکا ہے اُن میں اب صرف دو کا شایع ہونا باقی رہ گیا ہے۔ ایک میر کا فارسی دیوان[1]۔ دوسرے ایک عشقیہ قصہ فارسی نثر میں[2]۔ یہ وہی قصہ ہے جس کو میر نے اُردو نظم کے لباس میں بھی مثنوی دریائے عشق" کی صورت میں پیش کیا ہے۔

"نکات الشعرا" اور "ذکرِ میر" دو آئینے ہیں کہ میر کی سوانح نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر میر کے قلم کی رفتار تصوف اور الٰہیات کی دشوار گزار منزلوں میں دیکھنا ہو تو "فیضِ میر" پڑھیے۔ "فیضِ میر" ایک مختصر رسالہ ہے مصنف نے نہایت مختصر حمد و نعت کے بعد لکھا ہے:

> "میگوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسرمن ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود۔ لہٰذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار ربا یاند ک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ "فیضِ میر" گزاشتم۔"

یہ عبارت بتاتی ہے کہ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی کے لئے لکھا اور انہیں کے نام کی رعایت سے اس کا نام "فیضِ میر" رکھا۔ میر صاحب! سبحان اللہ! سبحان اللہ!! آپ کے ذوقِ لطیف اور حسنِ تلاش کی داد کون دے سکتا ہے؟ کتاب کس نے لکھی،

---

[1] میر کے فارسی دیوان کا ایک قلمی نسخہ میرے کتبخانے میں موجود ہے۔ اور دوسرا میں نے سبحان اللہ خاں صاحب رئیس گورکھپور کے کتبخانے میں دیکھا تھا موصوف نے اپنی بیشتر کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو عطا فرما دی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دیوان اب اسی یونیورسٹی کے کتبخانے میں پہونچ گیا ہو۔

[2] رسالہ "نیرنگ" رامپور کے میر نمبر میں جولائی ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا تھا۔ اس قصے کے چند اقتباس موجود ہیں۔

کس کے لئے لکھی اور کس موضوع پر لکھی۔ مذاق سلیم ان سب باتوں پر نظر کرتا ہے اور اس نام کے مزے لیتا ہے۔

میر کے ایک بیٹے میر عسکری عرف میر کلو عرش لکھنؤ میں رہتے تھے۔ نساخ کا قول ہے کہ ان کا تخلص پہلے زار تھا پھر عرش ہوا[1]۔ ان کے نام سے تو اکثر لوگ واقف ہیں۔ تذکروں میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ محمد جان شاد لکھنوی سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ شاد کو یہ فخر حاصل تھا کہ انھوں نے لڑکپن میں اپنی ایک غزل حضرت میر کو بھی دکھائی تھی اور اس فخر کے اظہار کے لئے وہ اپنے کو "پیرو میر" کہا کرتے تھے۔ یہ طرۂ افتخار ان کی دستار کمال پر ایسا پھبا کہ آج تک انھیں لفظوں سے انکا پتا دیا جاتا ہے[2]۔

عرش کے علاوہ میر کے کسی دوسرے بیٹے کا نام مشہور نہیں ہے۔ فیض کے حال میں اکثر تذکرے خاموش ہیں۔ نساخ نے ان کے بارے میں صرف یہ چند لفظ لکھے ہیں:-

"فیض تخلص میر فیض علی خلف میر تقی میر مقیم لکھنؤ"[3]

اور ان کے یہ تین شعر نقل کئے ہیں:-

کہہ دیا سب سے جو کہ تھا معلوم ۔۔۔ دل ترا حوصلہ ہوا معلوم

شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحر حسن ۔۔۔ موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

یہ ترک چشم تیرے مست ہیں جوان دونوں ۔۔۔ کہ سو رہے ہیں تلے سر کے رکھ کمان دونوں

شیفتہ کا بیان ہے کہ میر فیض علی فیض پسر میر تقی مرحوم وزیر الممالک کی سرکار میں اپنے باپ کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ سخن وری کا غرور ان کو بہت تھا۔ لیکن

---

[1] تذکرہ سخن شعرا صفحہ ۳۲۳ ۔ [2] آب بقا صفحہ ۳ و صفحہ ۱ + سخن بے مثال (دیوان شاد) دیباچہ۔
[3] سخن شعرا صفحہ ۳۷۶

میری نظر سے ان کا کوئی شعر ایسا نہیں گزرا جو ان کے دعوے کا ثبوت ہوتا ۔ شاید ان کی نازش باپ کی شاعری کی بنا پر ہو۔[۱]

مصحفی میر فیض علی سے بخوبی واقف تھے اس لیے اُن کے بارے میں ان کا بیان سب سے زیادہ معتبر ہے ۔ لکھتے ہیں :-

"فیض تخلص پسر میر محمد تقی میر جوان صلاحیت شعار است بمقتضاے موزونیِ طبع کہ موروثی است گاہ گاہے بروضع خاندان خود لب بزمزمۂ ریختہ می کشاید و اند کے حصہ از عجب پدر ہم دارد"[۲]

مصحفی نے فیض کی چار غزلوں سے چند شعر بھی دیے ہیں جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں :-

نہ مانی تو نے میری اپنی ہی ضد بیوفا رکھی ‏ ‏ کہیں اب کس سے ہم جا کر ہماری تو نے کیا رکھی

شبِ وصل آئی تھی یاد سوتن اپنے الفتی سے کاٹی ‏ ‏ ہمارے اپنے ان نے درمیاں تلوار لا رکھی

کدورت جب تیرا انداز نے نکالی کی تیرے ‏ ‏ ہماری خاک اس کوچے میں تو نے کب صبا رکھی

بنانے صانعِ قدرت نے کیا کیا پھول گل یوں تو ‏ ‏ مگر اس گلبدن میں کچھ ادا سب سے جدا رکھی

دور میں ساقی ترے آ نکلے ہیں مے نوش ہم ‏ ‏ جام خالی دے ہے کیا اتنے نہیں بے ہوش ہم

سر فرو لاتے نہیں دلبندوہاں عشق کے ‏ ‏ سایۂ بالِ ہما پر مارے ہیں پاپوش ہم

بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفتہ.... ‏ ‏ چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم

شوق ہیں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن ‏ ‏ موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

دل نہایت ہے کہ چھپا کر دیکھ لیں ہم فیض ‏ ‏ عمر گزری نا کسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

---

[۱] گلشن بنجار صفحہ ۱۵۲ - [۲] مصحفی کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے -

گل کھائے جنھوں کے لئے جسم اوپر ... وہ پھول بھی نہ لائے گیے وہ مزار پر

یاری کی مت امید رکھا کر رقیب سے ... اک میں ہی ناتوان ہوں بھاری نزار پر

کیا کیا طیور آ کے سر تیر پھر گئے ... کچھ ان دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر

یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں ... مت بھول آہ یہاں کے تو نقش و نگار پر

روش بھائی ہو کیا ان خوبصورت گلعذاروں کو ... لئے آئینہ دیکھا کرتے ہیں اپنی بہاروں کو

نہیں معلوم کس رشک قمر کی راہ تکتے ہیں ... کہ ساری رات آنکھوں میں کٹا کرتی ستاروں کو

خدا جانے کہ تجھ سے فیض کیا اسکو ہے بیزاری

جہاں دیکھا تجھے اُس نے پکارا اپنے یاروں کو

میر کے دو بیٹے تو شاعر تھے ہی - اگر تذکرہ "شمیم سخن" کی روایت صحیح ہے تو میر کی ایک بیٹی بھی صاحب دیوان شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں[۱]۔

میر کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہو چکا ہے کہ "رسالہ فیض میر" میں پانچ حکایتیں بیان کی گئیں ہیں لیکن یہاں حکایت سے مراد نہ بادشاہوں و وزیروں کے قصے ہیں نہ دیووں اور پریوں کی کہانیاں ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سُنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی باتیں ہیں - یہ واقعات ہوں یا میر کی خوش اعتقادی کے کرشمے - بہر حال ان کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے - اور واضح ہو جاتا ہے کہ شاعروں کے پیر[۲] حضرت میر ایک فقیر منش بزرگ تھے - صوفی درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے - ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دلجوئی کو فرض انسانیت سمجھتے تھے - ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحب کرامات مانتے تھے - تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی - ان کو غور سے سُنتے

۱؎ شمیم سخن صفحہ ۲ - ۲؎ میر خود کہتے ہیں - ع - گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں -

تھے اور سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے جسکی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ کی گود میں ہوئی ہو اس کی طبیعت کا انداز اور کیا ہوتا۔

میر کی شاعری کو بخوبی سمجھنا ہو تو میر کو سمجھئے اور میر کو سمجھنا ہو تو "ذکر میر" اور "فیض میر" پڑھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہہ کو پہونچنے کے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ "ذکر میر" اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو "فیض میر" اُن کی سیرت کی سچی تصویر۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا انداز طبیعت' پرواز خیال' اور طرز کلام بھی خوب سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے عشق حقیقی کے معاملات اور تصوف کے خیالات جو ہماری شاعری کو زینت دیتے ہیں اُن کے ذہن نشین کرنے میں بھی اس رسالے سے بہت مدد ملیگی۔

میر کی معاشرت' حالات زندگی اور تعلقات خاندانی کے بارے میں اس رسالے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے لئے طشت اور آفتابہ استعمال کرتے تھے۔ شہسواری جانتے تھے مگر گھر میں گھوڑا نہ تھا۔ "اکبر آباد" کو چھوڑ کر دہلی میں رہنا شاق تھا۔ انکے ایک بیٹے فیض علی تھے اور ایک عزیز محمد حسین کلیم تھے جو اسحٰق خاں شہید کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی کے یہاں پچاس روپے ماہوار پر نوکر تھے۔

انھیں محمد حسین کلیم کے بارے میں میر نے "نکات الشعرا" میں لکھا ہے کہ شاہجہان آباد کے رہنے والے ہیں۔ سپاہی پیشہ آدمی اور ریختے کے زبردست شاعر ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ قصیدے' مخمس اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کا طرز کسی کے طرز سے نہیں ملتا ہے لیکن اکثر مرزا بیدل کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ان کے تہہ دار شعروں کے سمجھنے میں فہم عاجز ہے۔ ان کی طبع رسا سیلاب کی روانی رکھتی ہے اور ان کی فکر رسا آسمان کی

لہ ذکر میر صفحہ ۲

اُس پار نکل جاتی ہے۔ فارسی میں ایک کلیم گزرا ہے لیکن فقیر کے نزدیک کلیم ریختہ ہیں
بندے کو ان کی خدمت میں جو قرابت قریبہ حاصل ہے اُس سے قطع نظر ان کے ساتھ ایک
دلی خلوص رکھتا ہوں۔ اکثر اِس ہیچداں کے حال پر شفقت فرماتے ہیں۔ خدا انکو سلامت رکھے[1]

میر کے اس بیان سے بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ اُن میں اور کلیم میں کیا قرابت تھی۔ میر حسن نے
کلیم کو دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ جوان محمد شاہی گندم گوں، دراز قد تھے میر سے قرابت قریبہ رکھتے
تھے۔ مرزا لطف نے بھی کلیم کو میر کے قرابتیوں میں لکھا ہے لیکن انکا رشتہ نہیں بتایا ہے۔ شیفتہ نے کلیم کو میر کا
بہنوئی اور ان کے بیٹے میر محمد حسن عرف میر حاجی تجلی کو میر کا خواہر زادہ لکھا ہے[2]۔ تذکرہ سراپا سخن
کے مؤلف محسن نے بھی تجلی کو میر کا خواہر زادہ بتایا ہے[3]۔ لیکن کلیم کے دوسرے بیٹے میر محمد محسن
محسن کو میر کا برادر زادہ لکھا ہے[4]۔ حسن اور شیفتہ نے بھی محسن کو میر کا برادر زادہ بتایا ہے۔
لیکن کلیم کا بیٹا نہیں لکھا[5]۔ محسن کے نام میں ان دونوں کے یہاں کچھ اختلاف ہے۔
حسن نے اُن کا نام شیخ محمد محسن اور شیفتہ نے میر محسن لکھا ہے۔

محمد حسین کلیم کے بارے میں مختلف تذکروں سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ مسلّم الثبوت
شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نثر اور
نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب "فصوص الحکم" کا اُردو
میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک رسالہ یا بقول قائم کئی رسالے عروض و قافیہ پر لکھے تھے۔ ایک
دیوان اور چند مثنویاں بھی ان کی تصنیف سے تھیں۔ ان کے قصیدوں اور غزلوں کے شعروں
کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ آدمی قابل تھے۔ علم عروض اور فن شعر کے ماہر تھے لیکن
کلام بے نمک اور مشکل تھا اِس لئے مشہور نہ ہوا۔ محسن لکھتے ہیں کہ کلیم میر تقی میر کے شاگرد
تھے اور اُنھوں نے ابن عربی کے اکثر رسالوں کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن ان کا

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ٢٥ — [2] گلشن بیخار صفحہ ٢٠٠ — [3] سراپا سخن صفحہ ٢١٥ — [4] سراپا سخن صفحہ ٩٢
[5] تذکرہ میر حسن صفحہ ١٢٣ — [6] گلشن بیخار صفحہ ١٦٢

یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ قائم کا بیان تو یہ ہے کہ 'فصوص' کا ترجمہ اُردو نظم میں کر رہے تھے لیکن بعض عوارض کے سبب سے اس کام کو ترک کر دیا۔ میر حسن نے اُنکی اُردو نثر کی ایک کتاب سے ذیل کے چند جملے بھی نقل کئے ہیں جو بادشاہ احمد شاہ کے نابینا ہو جانے کے متعلق لکھے گئے تھے:۔

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر۔ آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو

بصیر۔ ایسی دولت سے زینہار زینہار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار"

میر حسن نے کلیم کو "شاعر زبردست و مشاق قدیم" قائم نے "پہلوان میدان سخن" لطف نے "کلیم طور سخندانی" اور شیفتہ نے "کلیم طور معنی پروری مسیح معجزہ سخنوری" لکھا ہے۔ کلیم کی تاریخ وفات کسی تذکرے میں نہیں ملی صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ "فیض میر" اور "نکات الشعرا" کی تصنیف کے وقت زندہ تھے لیکن میر کی زندگی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

میر نے "نکات الشعرا" میں کلیم کے بہت سے شعر دیئے ہیں۔ اُن میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

آتی ہے دل پہ قلقل مینا سے اب شکست — وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

دراز ہی شب ہجران زلف یار کلیم — تو مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

محمد حسین کلیم کا حال ذیل کی کتابوں میں دیکھیے:۔

(۱) نکات الشعرا صفحہ ۴۵۔ (۲) فیض میر صفحہ (۳) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۶۳

(۴) گلشن ہند صفحہ ۱۴۵ (۵) سراپا سخن صفحہ ۱۰۵ (۶) گلشن بیخار صفحہ ۱۴۳ (۷) مخزن نکات صفحہ ۴۳

تجھے برق خار سے کام کیا جو جیا ہے حق کو تلف نہ کر
یہ ازل کے دن سے نصیب ہے کفِ پا سے آبلہ دار کا

اب دم شمردگی سے مجھے کاروبار ہے — ہر دم مرے حساب سے روز شمار ہے

غرض حسنؔ ممکن نہیں کسی کی داد کو پہونچے — غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہونچے

میرؔ کو فارسی زبان پر جو عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ اُن لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے میرؔ کی خود نوشتہ سوانح عمری "ذکر میر" اور اُنکا تذکرہ "نکات الشعرا" دیکھا ہے۔ میرؔ کے ہمعصر بھی اُن کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر حسنؔ نے اُنکی نظم کے ساتھ نثر کی بھی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔
"چراغ نثرش روشن و ساخت نظمش گلشن"[1]

میرؔ بالعموم مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیے کے التزام سے عبارت کی شگفتگی بیساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شاید کہیں کہیں کچھ تصنع پیدا ہو گیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم قافیہ فقروں اور جملوں کی قید سے عبارت میں اکثر یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر فقرے اور جملے کے بعد جو دوسرا جوابی فقرہ یا جملہ آتا ہے اُس میں کبھی پہلے فقرے یا جملے کے مفہوم کی بیجا تکرار ہوتی ہے اور کبھی بے ضرورت لفظوں کی بھرتی ہوتی ہے۔ اس سے عبارت میں تصنع، طوالت اور سستی پیدا ہو جاتی ہے لیکن میرؔ کے یہاں یہ نقص نہیں ہے۔ ان کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چست ہوتے ہیں اور اپنا مفہوم علیحدہ رکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے آخر میں

---

[1] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۷۵

قافیہ لایا جاتا ہے وہ اکثر بے لطف معلوم ہوتی ہے لیکن میر کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجیب بہار دکھاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"پسر او راخون بگیرد۔ خورش بخواری بمیرد۔ ناگہاں آتش در افتد۔ رسم باش و بو بر افتد۔ از من آثار نماند۔ اینجا دیار نماند۔ آبادی غیرت وادی شود۔ ماریہ عصا راہ رود۔ مردمان تباہ۔ خانہا سیاہ۔ ازیں سرتا بہ آں سر ویرانہ۔ ایں باہم نشستہا افسانہ مجالہا آب برد۔ ایں جا قو نہ پرد۔"

"آں سرمایۂ جانہا کہ مقصود دلہا ست آئینہ درپیش دارد۔ و سرے با خویش گرم تماشائے خود است۔ و محو سراپائے خود۔ اگر بر آسمان نظم روی بے پرواست۔ ور خاک شوی ہماں گرم استغنا بیرنگی او رنگہا دارد۔ و ساز وحدتش آہنگہا۔ شفق یادمی دہد از رنگ آلش۔ گل میگوید کہ گل بجا لش۔"

"نومیدی از برائے چہ مقصود ہمکنار ست۔ دل تنگ چرا نشستہ کہ عالم ہمہ یار ست۔ برخیز و سیاحت کن۔ خوش باش و فراغت کن۔ بر خاتم ہمراہ شدم آگاہے بود آگاہ شدم۔"

"خدا طرفہ خود آراست۔ غریب دلبر خود نماست۔ گرد راہش قیامت انگیزد۔ طرز خرامش بلاہا ریزد۔ کار او ہیچ بفہم در نیاید۔ دانش اعتراف عجز می نماید۔ حیران کار خردمند۔ در عجب وقت پسند۔ او سرگرم کار۔ فکر در آزار۔ آگاہ ناآگاہ۔ دلیل گمراہ۔ ادراک نہ فہم۔ ایں جا ہمہ وہم۔"

میر اپنی نثر میں عام طور پر قافیہ کا التزام کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ قافیے کی تلاش میں مطلب کی راہ بھول جائیں۔ اور نہ یہی ہے کہ بغیر قافیے کے قدم آگے نہ بڑھائیں ایسے جملے اور فقرے بکثرت ہیں جن کے جوابی جملے اور فقرے نہیں لکھے ہیں۔ اسکے علاوہ کہیں کہیں دُور تک نثر عاری لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً:۔

"یا آنکه محو یاد الٰہی می بود اما ربط درستے بہ شعر و شاعری داشت۔ یکے دم صبح مرا خواست۔ چوں حاضر شدم گفت کہ خفقان بشارت دارم۔ واشدے نہ میشد۔ شعرہائے عاشقانہ بخوان کہ زار بگریم۔ اتفاقاً ایں شعر از زبان من بر آمد۔
بسر پیش دل تو شکیب من تا مش کہ از برائے تپیدن بہانہ می طلبد
دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردان بردو و غش بر داشتہ اندرون خانہ بردند۔ ازاں بعد بیروں نیامد۔ دو سہ روز حال عجیبے داشت۔ گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر در گزشت۔ خدائے کریمش بیامرزاد"

توصیفی فقروں کے بنانے میں میر کو بڑا کمال تھا۔ وہ جب کسی کے اوصاف بیان کرنے پر آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے فقرے پے در پے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"اسد دیوانہ۔ ساکن ویرانہ۔ سالک مجذوب۔ درویش خوب۔ رند بوریا پوش۔ چوں بحر در جوش"

"مردے بود کامل۔ ہمہ تن دست و دل۔ بالا بلند۔ وقت پسند۔ گرم جوش۔ سراپا ہوش۔ چسپاں اختلاط۔ خوش ارتباط۔ وضع مربوط۔ حال مضبوط۔ دل بایار دست در کار۔ قائم اللیل صائم النہار۔۔۔۔۔۔۔۔
رو از دنیا برتافتہ۔ عارف قرار یافتہ۔۔۔۔۔۔۔۔ چادر بر دوش۔ بایک

ستر پوش - پابے کفش سر عریاں - گاہے خنداں گاہے گریاں ‘‘

’’ دلیل راہ عرفان - میاں شاہ برہان - دست از دنیا برداشتہ - قدم براہ فنا گزاشتہ - آوارۂ بمنزل رسیدہ - بہ گلیم سیہ سر درکشیدہ - سفید گو و برہنہ تن - با معنی در یک پیرہن ‘‘

ہمیر کو فلسفۂ الٰہیات کے مسائل سے دلچسپی تو تھی ہی وہ اُن کو بڑی خوبی سے بیان بھی کر سکتے تھے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :-

’’ لذت دریافتن چیزے ملائم است - والم دریافتن چیزے منافی آں - ہر قوت را از قوتہا مدرکات لذت والم است بحسب آں قوت - چنانکہ لذت باصرہ در دیدن محبوب و لذت سامعہ در سمع آواز خوب - چنانکہ مدرک عظیم تر لذت قوی تر - و گر از اضداد است رنج والم زیادہ است - چوں ہیچ مدرک شریف تر از ذات و صفات واجب الوجود نیست پس ہیچ لذتے لذیذ تر از معرفت او نباشد - و قوتہائے جسمانی با بدان می روند یعنی از فنائے آں باطل میشوند - قوت عقلی کہ لذت والم را می داند با نفس ناطقہ باقی می ماند - ادراک نفس متعلق بہ بدن قاصر و مجرد در مشاہدۂ جمال او ناظر ‘‘

’’ در اثبات بعث و حشر دلائل بسیار است - اما عود نفس بہماں بدن دشوار است - مثلش - مثلاً آدمی مرد و خاکش ہمہ خورد - و پس از روزگار طویل اجزائے ارضی بہ نبات متحیل نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذائے انسان - اگر ہمت بہ حشر ہر یک بار ند بکدام صورت باز آرند - معہذا نفوس مفارقہ را غایت نیست -

وابدان و مادہ را نہایت۔ اگر حشر کنند و بہ قسمتِ مواد گرایند نفوس از مواد البتہ بیشتر آیند۔ .... حقیقت جان آدم قایم ست بذاتِ خویشتن وگفتگوے قالب در اینجا بر قالب زدن۔ گمان مبر کہ معنی مرگ نیستی جان عزیز است۔ این انقطاع تصرف او از قالب ناچیز است معنی بعث و حشر آن باشد کہ جان را قالب ہمان باشد۔ قالب مرکبے بیش نیست از بدل آں چہ زیان است۔ رو و بدل با سوار است۔ سوار خود ہمان است"۔

"بہشت و دوزخ کہ قالب دراں شریک است متعارف است۔ حاصل یکے حور و قصور و انہار و اشجار۔ حاصل دیگرے زہر و زقوم و نار و مار۔ اما بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذت و الم جانی۔ حاصل آں دریافت معقولات و مشاہدہ آں ماہِ تمام۔ حاصل ایں شرم و خجالت و سوختگی و آلام۔ حکما میگویند کہ نفس را بعد موت لذت عظیمے است کہ لب بتوصیف او نتواں کشاد۔ یا درالم الیمے است کہ شرح آں نتواں داد۔ اشارت بہ ایں دو حال است نفوس کاملہ را لذتِ دوام ناقصہ را رنج و الم مدام"۔

میر کے قبضے میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اور ان کے استعمال پر اُن کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے۔
"فیضِ میر" کا زمانہ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا۔ اتنا پتہ تو چلتا ہے کہ میر نے یہ رسالہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد۔ میر محمد حسین کلیم کی زندگی میں۔ اور میاں سعید خاں کے انتقال کے بعد لکھا لیکن کلیم اور سعید خاں کے انتقال کی تاریخ بھی معلوم نہیں۔ ورنہ اس

رسالے کی تصنیف کا زمانہ معین کرنے میں کچھ مدد ملتی۔

رسالہ "فیض میر" کا جو نسخہ میرے کتبخانے میں ہے وہ بدخط بھی ہے اور کرم خوردہ بھی۔ اس کے پڑھنے میں پوری کوشش کی گئی پھر بھی بعض لفظ مشتبہ رہ گئے۔ جی چاہتا تھا کہ اگر اس رسالے کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے تو اس سے مقابلہ کر کے مشتبہ مقامات کی تصحیح کر لی جائے۔ خدا خدا کر کے پتا لگا کہ رام پور میں ایک صاحب کے پاس یہ رسالہ موجود ہے۔ کامیابی کی یہ صورت جو نظر آئی تو میرا شوق مجھ کو رام پور کھینچ لے گیا لیکن انتہائی کوششوں پر بھی رسالے کا مقابلہ ممکن نہ ہوا۔ مقابلے کا کیا ذکر مالک رسالہ نے واقف حال لوگوں کو اپنا نام بتانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ بہر حال میں پروفیسر سید محمد نقی صاحب شادماں اور مولوی عزیز اللہ خاں صاحب مدیر رسالہ "نیرنگ" کا شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے اس معاملے میں کافی کوشش کی اور مالک رسالہ کا بھی کہ آپکے طرز عمل کی بدولت انسانی فطرت کا ایک نیا پہلو پیش نظر ہو گیا۔ اب اس کتاب میں جو غلطیاں ملیں ان کا ذمہ دار ناظرین مجھ کو نہیں بلکہ انھیں رام پوری حضرت کو قرار دیں۔ جنھوں نے مجھ کو ان غلطیوں کی تصحیح کا موقع نہ دیا کسی نے خوب کہا ہے ؎

خدا جزا دہ بہ آناں نہد کہ چارۂ دل　　　　بہ یک نگاہ نہ کردند و میتوانستند

"فیض میر" فارسی میں ہے اور فارسی بھی ایسی جس کا سمجھنا بہت آسان نہیں۔ اس لئے کتاب کی نفع رسانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے اس کا خلاصہ اُردو میں لکھا جاتا ہے۔ یہ خلاصہ کیا ہے کتاب کا آزاد ترجمہ ہے جس میں کہیں کہیں کچھ جملے بے ضرورت سمجھ کر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

پہلی حکایت

ایک دن میں ایک مشہور درویش سے ملا جس کا نام شاہ سما تھا اور جو دن رات استغراق کے عالم میں رہا کرتا تھا۔ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور کہنے لگا کہ تم اس قدر پریشان حال کیوں ہو۔ اگر تمہارے دل کو اس سراپا ناز سے تعلق ہے۔ تو خود اپنے آپ پر نظر رکھو کیونکہ

باوجود اس تنزہ اور تقدس کے وہ ایسا تعلق رکھتا ہے کہ اُس میں اور تم میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ گو کہ وہ اپنے کمال ظہور حسن کی وجہ سے آفتاب نصف النہار کی طرح حجاب میں ہے لیکن دُنیا کا کوئی ذرہ اس کے پرتو سے محروم نہیں ہے۔ غور کرو اور اپنی حقیقت کو سمجھو۔ تم خود ہی اپنا مقصود ہو۔

شام کے وقت مشکیزہ کندھے پر رکھے ہوئے بازار میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا کہ اے ہستی کے کم آب دریا کے ساحل پر پیاسے رہنے والو اگر تم میں سے کوئی اپنے لب تر کرنا چاہتا ہو، تو آئے۔ جب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے تو کسی کو دودھ اور کسی کو شکر کا شربت پلاتا تھا۔ ایک دفعہ پہر رات گئے مجھ سے کہنے لگا کہ اگر کہیں سے جو کی روٹی ملتی تو میں سیر ہو کر کھاتا۔ میں اپنے گھر آیا سب لوگ سو گئے تھے صرف ایک بوڑھی خادمہ جاگ رہی تھی میں نے اُس سے روٹی مانگی اُس نے بہت جز بز ہو کر روٹی پکا دی۔ جب میں وہ روٹی اُس درویش کے پاس لے گیا تو وہ کہنے لگا کہ یہ آدمی کے کھانے کے قابل نہیں ہے۔ اس پر ایک کتیا بھوکی ہے۔ اسے لے جاؤ اور کتوں کے آگے ڈال دو۔ غرضیکہ اُس نے وہ روٹی کسی طرح نہ کھائی اور مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔

ایک بوڑھی تیلن اس کی معتقد تھی اکثر اس کے یہاں روٹی کھا لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس فقیر پر ایک حالت طاری ہوئی کہ بند سے بند جُدا، اور سر ہوا میں معلق۔ بڑھیا یہ حالت دیکھ کر چیخنے لگی کہ اے محلے والو کسی نے "میاں ساہا" کو قتل کر ڈالا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اس شور و غوغا سے درویش اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکنا اور نفرین کرنا شروع کیا۔ کہ جس کسی نے میرا یہ راز فاش کیا ہے اُس کا لڑکا آج ہی رات کو قتل ہو جائے۔ وہ خود ذلت کی موت مرے۔ ناگہاں آگ لگ جائے میرا نشان نہ رہے یہاں آدمی کا نام نہ رہے۔ آبادی ویرانہ ہو جائے۔ ایک سانپ کا اژدہا سے گزر ہو کے دمی تباہ اور گھر سیاہ ہو جائیں۔ یہ محلہ بہ جائے اور یہاں ایک چڑیا تک نہ دکھائی دے۔

اتنے میں دن ختم کے قریب پہونچا۔ درویش نے منہ ہاتھ دھوکر نماز پڑھی۔ اور مجھ سے مہربانی سے کہا کہ اے عزیز آج شام سے پہلے ہی چلا جا۔ فقیر کے لئے تشویش کا سبب نہ بن۔ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ یہ محلہ نزول حادثات کا محل ہے۔ قریب ہے کہ عافیت یہاں سے رخصت ہو اور مصیبت نازل ہو۔

رات کو کوئی دو سو چور تلواریں لئے ہوئے آئے اور ان میں سے دو تین آدمی کمندیں ڈال کر بڑھیا کے کوٹھے پر پہونچے۔ اس کا بیٹا ان سے مقابل ہوا مگر تلوار کے ایک ہی وار میں ختم ہو گیا۔ چوروں نے گھروں میں آگ لگا دی اور اطمینان سے لوٹ مار کر چل دیے لوگوں نے ڈر کے مارے محلہ چھوڑ دیا مگر ابھی کوئی پناہ کی جگہ بھی نہ ملی تھی کہ دفعتاً کالی گھٹا چھا گئی اور ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگی۔ اس کو ایک پہر بھی نہ گزرا تھا کہ پانی کا ایک سمندر امڈتا ہوا جنگل کی طرف سے شہر میں آیا اور مکانوں کو بہا لے گیا۔ جب سیلاب دور ہوا تو عمارتوں کا نشان بھی نہ تھا۔ وہ محلہ کف دست میدان ہو گیا تھا۔

میں حیران و پریشان فقیر کے تکیے کی طرف چلا۔ راستے میں میری نگاہ اس بڑھیا پر پڑی۔ میں نے اس سے حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ تفصیل کیا بیان کروں۔ فقیر کی نفرین نے یہ حال کیا ہے۔ اگر اس سے ملاقات ہو تو کہنا کہ میں اپنی سزا کو پہونچ چکی۔ اب دعا کرو کہ موت میری مشکلیں آسان کر دے۔ میں نے کہا اطمینان رکھو۔ اگر موقع ملا تو تمہارا پیغام اس تک پہونچا دونگا۔

ابھی کوئی ایک تیر کے ٹپے پر پہونچا ہونگا کہ راستے میں ایک کالا سانپ آندھی کی طرح چلا آرہا تھا میں سڑک سے ہٹ گیا اور بالا بالا فقیر کے تکیے پر پہونچا۔ دیکھا کہ فقیر جامہ ببری پہنے شیر کی کھال پر بیٹھا ہوا ہے۔ اسکی ہیبت ناک ہیئت نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ میرے پیر کانپنے لگے۔ اسکی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اور وہ ہر طرف ایسی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ دیکھنے والے کا پتا پانی ہوتا تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو۔ میں نے

عرض کیا کہ میں اُس تازے ویرانے کو دیکھنے گیا تھا۔ اُس بُڑھیا سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سُن کر اُس نے مُنہ بنایا اور کہا کہ فضول نہ بکو۔ ایک سانپ گیا ہے جو اس کا کام تمام کردیگا۔ گھڑی بھر کے بعد خبر آئی کہ بڑھیا تیلن کو سانپ نے کاٹ لیا۔ میں اس واقعے سے حیران ہوا اور خاموش رہ گیا۔ کہنے لگا کہ تم کہو کیوں گئے۔ آج رات کو وہی سانپ مجھ روسیاہ کو بھی کاٹے گا۔ میں اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ اُس نے کہا کہ فقیر کے غصے کی آگ جب بھڑک اُٹھتی ہے تو خشک و ترسب کو جلا ڈالتی ہے۔ اب میری زندگی کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ دو تین باتیں کہتا ہوں سنو اور یاد رکھو۔ یہ دُنیا ایک دلکش کارواں گاہ ہے یہاں سے حسرت کے سوا کچھ ساتھ نہیں جاتا۔ افسوس ہے اس شخص کی اوقات پر کہ جو جلد آگاہ نہیں ہوتا۔ شیرانہ زندگی بسر کرو۔ اور آخرت کی فکر کرو۔ وقت جو بھاگا جا رہا ہے اُسے ضایع نہ کرو۔ افلاطون باوجود اس کمال کے مسافروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور گھڑی گھڑی روتا تھا۔ ایک شاگرد نے اس کا سبب پوچھا۔ اُس نے جواب دیا کہ موت کا مرحلہ جس کو درپیش ہو وہ کیونکر نہ روئے۔ سمجھ لو کہ وہ سرمایۂ جان جو دلوں کا مقصد ہے اپنے دیدار میں مصروف۔ اور اپنے سراپا میں محو ہے۔ اگر ساتویں آسمان پر پہونچ جاؤ تو بھی بے پرواہ ہے اور اگر خاک ہو جاؤ تو بھی مستغنی ہے۔ اس کی بے رنگی میں رنگ ہیں۔ اور اس کے ساز وحدت میں آہنگ ہیں۔ وہ پردۂ کثرت میں نواسازی کرتا ہے۔ شش جہت سے اسکی آواز آتی ہے۔ موت کا ذکر کرتے رہو اور قبرستان میں جایا کرو۔ تاکہ اپنے جانے سے غافل نہ رہو۔ اور طفلانہ کھیل کی طرف مائل نہ ہو۔ جاؤ اب شام ہوئی مجھ کو بھی چلنے کی فکر ہے۔ امید ہے کہ صبح کو میرے جنازے پر آؤ گے اور دوستی کی صحبت کا حق بھول نہ جاؤ گے۔

تکرار کی مجال نہ تھی۔ میں نا اُمید اُٹھ کھڑا ہوا۔ غم کی شدت سے کچھ کھایا بھی نہ گیا ساری رات بیقراری میں بسر کی۔ ابھی صبح بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک شور اُٹھا کہ "شاہ صاحب" کو سانپ نے کاٹا اور اُس کا کام تمام ہو گیا۔ دل قابو سے نکل گیا۔ پیروں کی طاقت نے

جواب دے دیا۔ ایک دوست کے گھر سے گھوڑا منگوایا اور اُس پر سوار ہو کر وہاں پہونچا فقیر کے جنازے کی نماز میں شریک ہوا۔ اس کی میت اسی تازہ ویرانے میں خاک کے سپرد کر دی گئی۔ کیا لکھوں کہ اس فقیر کی موت کا کتنا غم ہوا۔ مہینوں میرا سینہ جلا کیا اور برسوں اس کا خیال میرے دل سے نہ گیا۔

دُوسری حکایت

میں نے سُنا کہ ممتاز گنج جو اکبر آباد کا ایک محلہ ہے اسکے ویرانے میں ایک وحشت زدہ فقیر رہتا ہے جو کبھی دکھائی دیتا ہے اور کبھی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مجھے اسکے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اتفاق سے اُسی دن ویرانے سے اس محلّے کی بازار کی طرف اس کا گزر ہوا۔ بازار والوں نے اُسکو دیوانہ سمجھ کر ڈھیلے مارنا شروع کئے۔ اُس نے کہا دیکھو ایسا نہ ہو کہ مجھ کو کوئی گزند پہونچ جائے۔ ورنہ یہ محلہ جل کے خاک سیاہ ہو جائیگا۔ بحث نے طول کھینچا۔ اور ایک ڈھیلا اسکے کندھے پر لگا۔ ڈھیلے کا لگنا تھا کہ آگ کی ایک چنگاری ہوا سے اُڑ کے روئی کے ایک ڈھیر پر جا پڑی۔ ایک شعلہ اُٹھا اور بازار کی طرف چلا۔ دم بھر میں وہ آگ اتنی بھڑکی کہ اُس کے بجھانے کے لئے پانی بھی میسر نہ ہوا۔ اینٹ پتھر لکڑی غلہ سب کا سب جل کے خاک ہو گیا۔ چھوٹے بڑے اپنی اپنی فکر میں پڑ گئے اور فقیر نے اپنی راہ لی۔ اور دریا کے کنارے پہونچ کر اپنے پاؤں دریا میں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اسکے پیچھے پیچھے دوڑتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے سامنے گیا اور جرأت کر کے اُس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا "احسن اللہ" نام اور لقب "رام"۔ پوچھا وطن؟ کہا دکن۔ پوچھا یہاں آنے کا سبب؟ کہا یہی آوارگی۔ میں نے منت کی کہ اپنا حال صاف صاف بیان کیجیے۔ اُس نے کہا کہ اے عزیز جوانی کا زمانہ تھا سر میں اک شور بھرا ہوا تھا۔ ایک رات گھر سے باہر نکلا۔ بازار میں ایک جگر سوختہ قلندر نظر آیا جو اپنے نقرئی شیر قلاب کو جس کا پنجہ ٹوٹ گیا تھا ایک

سنار کی دوکان پر کھڑا درست کروا رہا تھا۔ تسبیح اُسکے ہاتھ میں تھی۔ اُسکو برابر پھیر رہا تھا
اور یہ دعا پڑھ رہا تھا سبحان من لیس للخلق الا معرفتہ سبیل۔ اس بات کا میرے
دل پر بڑا اثر ہوا۔ میں شہر سے باہر آیا اور سراسیمہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہونچا۔ کچھ دن
وہاں کی مصیبتیں جھیلیں۔ درختوں کے پتوں پر بسر کی۔ رات دن روتا تھا۔ نہ بولتا تھا نہ سوتا
تھا۔ دیوانوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد میں روسیاہ ایک پتھر پر
بیٹھا ہوا پتوں کا ناشتا کر رہا تھا۔ ناگاہ ایک خدارسیدہ سیاح میری داہنی جانب سے ظاہر
ہوا۔ میں نے اُسی پتھر پر اُسکے لئے جگہ کر دی۔ دو تین پتے اُس نے بھی کھائے۔ ذرا دیر آرام
کیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا "اے عزیز شاید تو اس پریشاں اختلاط محبوب کا دلدادہ ہے
جسکی جگہ ہر دل میں ہے۔ اس قیامت خرام کا وارفتہ ہے جو صرف ناز اپنے لئے ہے۔ وہ سرتاپا
ناز عجب رنگین چال چلتا ہے کہ اس کے طرز رفتار سے چمن چمن جان برستی ہے۔ اسکی
بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے دامن کی ہوا سے ایک دُنیا برباد ہو جائے تو اُس کو
پروا نہ ہو۔ جس تنکے کو وہ بڑھا دیتا ہے وہ سمندر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا۔ ناکامی کی تلخی کے
باعث اُس کے شیریں لبوں سے دل برداشتہ نہ ہونا چاہیے۔ وہ ناامیدی کو دوست نہیں
رکھتا۔ اور وہ آتش کا پرکالہ ایسے عاشق کے جھونپڑے میں قدم نہیں رکھتا۔ ناامیدی
کس لئے مقصود دہم کنارہ ہے۔ دل تنگی کیوں سارا عالم یار ہے۔ اُٹھ اور سیاحت کر خوش
اور مطمئن رہ۔ میں اُٹھا اور اُس کے ہمراہ ہو گیا۔ وہ آگاہ تھا میں بھی آگاہ ہو گیا۔

ایک دن نواح گوالیار میں ایک فقیر کے تکیے پر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کو نماز میں
مشغول تھا۔ ناگاہ ایک طوطے نے دو تین مرتبہ بڑے پُر درد لہجے میں "سبحان اللہ" کہا۔ غیرتِ
عشق نے میری حالت دگرگوں کر دی اور میں بیہوش ہو گیا۔ سیاح نے میرے مُنہ پر پانی کے
چھینٹے دئے۔ جب میں ہوش میں آیا تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ طوطے کے
ذکر کرنے سے میرے دل پر چوٹ لگی اور غیرتِ عشق نے مجھے بدحواس کر دیا۔ اس نے

کہا کہ اس محبوب کا بھی عاشق کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اگر وہ اسکو غیر سے مشغول دیکھتا ہے تو دل سے اتنا نزدیک ہوتے پر بھی دوری اختیار کر لیتا ہے۔ اُسکے اشارے سے فتنہ اُسکی طرف دوڑتا ہے بلکہ جان لینے تک ساتھ رہتا ہے۔

"ایک فقیر اپنے تاریک جھونپڑے سے کبھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ایک دن اس کے ایک مُرید نے کہا کہ اس شہر کی چاندنی راتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ وہ اُسکی خاطر سے باہر نکلا۔ ابھی چاند کی طرف نگاہ بھی نہ کی تھی کہ ایک ترک ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے پہونچا اور اس سے پوچھنے لگا کہ فلاں شخص تو ہی ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ ترک نے کہا کہ لوگ تجھ کو مستجاب الدعوات کہتے ہیں۔ میرا غلام روپیوں کی ایک تھیلی لے کر بھاگ گیا ہے۔ دعا کر کہ وہ مل جائے۔ اگر دعا نہ کریگا تو میں تجھے قتل کر ڈالونگا۔ درویش اصل حال سے باخبر تھا۔ سمجھ گیا کہ اُس مجسم ناز و عتاب کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں اُس کے چاند سے چہرے کی یاد چھوڑ کے چاندنی میں بیٹھوں۔ وہ بہت متنبہ ہوا اور اس ترک سے کہا کہ صبح صادق سے پہلے دریا کے کنارے پہونچ جا اور جو کشتی سب سے پہلے روانہ ہو اُس پر سوار ہو جا۔ انشاءاللہ تیرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ترک نے ایسا ہی کیا۔ اور غلام کو مع روپے کے اُس کشتی میں پایا۔ وہ درویش مرتے مر گیا مگر پھر نہ کسی سے ملا نہ باہر نکلا۔

"جب میں نے آگے بڑھنے کا قصد کیا تو وہ سیاح سامنے آیا اور کہنے لگا کہ مجھ مفلس کو کن خرابیوں کے بعد تیری سی دولت جنگل سے ہاتھ لگی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ میں تجھ کو ہاتھ سے کھو بیٹھوں۔ یہاں سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ باڑی ہے۔ وہاں میرے پیر کی قدم گاہ ہے۔ اگر چند روز کے لئے تو بھی وہاں چلے تو میں وہاں چراغ جلاؤں اور سعادت دارین حاصل کروں۔ میں نے کہا خدا حافظ۔ وہ تو اُدھر گیا اور میں شہر کے نواح کے ویرانے میں آ کر مقیم ہو گیا۔ دس مہینے کی مدت تنہائی میں بسر کی۔ آج وحشت مجھے شہر کی طرف لے آئی۔ اس جگہ کے ہمہ تن صفت لوگ میرے خون کے پیاسے

ہو گئے۔ اب میں یہاں اُس طرف کے اشارے کا منتظر بیٹھا ہوں" جب شام ہو گئی تو وہ نماز میں مشغول ہو گیا۔ میں اپنے گھر چلا آیا۔

صبح کو میں پھر اسکی خدمت میں پہنچا۔ دیکھا کہ اُسی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ کھانا میرے ساتھ تھا میں نے پیش کیا دو تین لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا لوٹا اور طشت حاضر ہے اور غلام موجود۔ کہنے لگا میں درویش ہوں مجھے ان چیزوں کا پابند نہیں ہونا چاہیے شاید تم نے مولانا کاتبی کے شعر نہیں دیکھے۔ ؎

در قصر لاجوردی خطابت بر کتابہ ۔ کاے بے زراں چہ حاصل از گنج و حجرابہ

پایانِ کار باید از جملہ دست شستن ۔ گر ماہ طشت داری ور مہر آفتابہ

میں نے کہا فرش کے لیئے چٹائی لایا ہوں۔ اُس نے کہا مجھے خاک سے سروکار ہے میں نے کہا ایک نئی چادر بہم پہونچائی ہے۔ اُس نے کہا یہ بوجھ اپنے کندھے پر نہ ڈالونگا۔ میں نے کہا پانی کے لیے ایک کاسہ خریدا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں نے کاسہ سر سے توڑ ڈالا ہے۔ میں نے کہا خرچ کے لئے قدرِ قلیل حاضر ہے۔ اُس نے کہا اس سے میں نے دل نہیں لگایا ہے۔ میں نے کہا اس میں سے کچھ تو قبول ہو۔ اُس نے کہا کیا چاہتے ہو کہ فقیر ملول ہو؟ میں خاموش ہو رہا۔

اِس اثنا میں ایک عورت خوبصورت خوش رنگ شوخ و شنگ چھینٹ سازوں کے قبیلے کی جو پانی بھرنے کے بہانے سے صبح و شام دریا پر آیا کرتی تھی اور ایک عالم اُس پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ مٹی کا گھڑا کندھے پر رکھے ہوئے بڑے ناز و انداز سے آئی۔ فقیر کی نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ کہنے لگا کہ اے دل اور دین کو غارت کرنے والی اس قدر کمراہی! جیا۔ رام رام کہا کر۔ یہ سنتے ہی اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ منہ پر خاک ملی اور رام رام کہتی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ اسکا یہ حال دیکھ کر سب کا دل خون ہو گیا۔ اسکا جنون بڑھتا گیا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا اور چند روز میں ختم ہو گئی۔ جب یہ خبر فقیر کو پہونچی تو اُس نے بڑا افسوس کیا۔ میں نے کہا یہ کیا ہوا۔ اُس نے کہا مقدر یہی تھا۔ فقیر کا کچھ جرم نہیں ہے۔ مقدر سے

کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ ایک فقیر بہت بیمار ہو گیا۔ طبیب نے پرہیز کی سخت تاکید کی۔ اُس نے کہا کہ یہ امر تقدیری ہے یا غیر تقدیری۔ اگر غیر تقدیری ہے تو مجھ کو نقصان نہیں پہونچ سکتا اور اگر تقدیری ہے تو منز اپنچ نہیں سکتا۔
وہ فقیر دو تین دن اور دکھائی دیا۔ اسکے بعد دریا کے کنارے سے کہیں اور چلا گیا۔

تیسری حکایت

"شاہ برہان" ایک خدا رسیدہ فقیر تھا جب کبھی شہر میں آتا تھا تو پتھر پر پتھر مارا کرتا تھا۔ ایک دن سواد شہر میں وہ مجھے دکھائی دیا۔ نہایت سفید چیز کا کوئی آدھ سیر کا ایک گولا ہاتھ میں لئے ہوئے ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اُس کی طرف دیکھتا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ خالص چاندی ہے۔ آخر میں نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ کیا چیز دیکھ رہے ہو کہنے لگا چاندی بھی بقول مرتضیٰ علی علیہ الصلوات عجیب چیز ہے کہ جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اُس کا نفع اُٹھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم فقیر ہو تم کو اس کی کیا پروا یہ چاندی مجھ کو دے دو۔ اُس نے چاندی ہاتھ سے ڈال دی اور اپنی کالی کملی اُٹھائی۔ میں نے اُس کی کملی پکڑ لی اور کہا کہ ذرا دیر ٹھہرو اور مجھ گنہگار سے کچھ باتیں کرو۔ اُس نے میری دل شکنی نہیں کی ہنسا اور بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آج خاک میں اٹے ہوئے تم کہاں سے آئے تھے۔ جواب دیا "من اللہ"۔ میں نے پوچھا کہاں جاؤ گے۔ کہا "الی اللہ"۔ میں نے پوچھا جنگل میں اپنی بسر کے لئے کیا سرمایہ تمہارے پاس ہے۔ جواب دیا کہ مجھ سے بے سروپا کا سرمایۂ دنیا و آخرت اللہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم جب کبھی دکھائی دیتے ہو تو پتھر پر پتھر مارتے ہوئے چلتے ہو۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ جواب دیا کہ پتھر پر پتھر مارنا اشارہ ہے تباہی کی طرف سمجھ لو کہ شہر کے باہر کی آبادی ویرانہ ہو جائے گی اور یہ جگہیں افسانہ۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا تھوڑے ہی دن کے بعد ظاہر ہو گیا۔

قلندر برہنہ تن شاہ مدن ہوا ہے اسکا ہمعصر ایک صاحب حال اور باکمال فقیر تھا اور جو کی
روٹی کے سوا کچھ نہ کھاتا تھا۔ شب جمعہ اُسکے تکیہ میں جو دروازے کے پاس تھا روشنی ہوتی تھی
ایک دنیا چراغان کی سیر کے لئے وہاں جاتی تھی۔ اسکی صبح کو وہ گدائی کے لئے نکلتا تھا اور
پیسے کے سوا کسی سے کچھ نہ مانگتا تھا۔ پیسہ مانگتا جاتا تھا اور یہ شعر پڑھتا جاتا تھا۔ ؎

آوردن زر دست آسان نبود   خوابیدہ بروئے سر غلولہ شیرست

ایک دن نخاس میں کہ ہندوستان میں گھوڑوں کی بازار کو کہتے ہیں آیا اور میرے قریب
بیٹھ گیا۔ میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ فقیر شعر سے مجھ سے واقف نہیں ہے۔ اگر یہ مجھ سے گفتگو
شروع کرے تو میں جانوں کہ یہ ضرور صاحب کمال ہے۔ ابھی ایک لحظہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ میرے اس
خیال سے واقف ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ اے عزیز! جسکو اللہ کہتے ہیں میں اور تو دونوں اُسی کی تلاش
میں ہیں۔ وہ عجیب قہتہ گر اور خود سر ہے۔ جب پیدا کرتا ہے تو گل تر کو خاک میں ملا دیتا ہے ادنیٰ اور
اعلیٰ کا وجود باقی نہیں رکھتا اور کمزور چیونٹی کی حفاظت کرتا ہے۔ ایک دفعہ مصر میں خشک سالی ہوئی
کیسے کیسے دلیر ہلاک ہوئے۔ اور کیسے کیسے لوگ خاک ہوئے جب اہل شہر سخت پریشان ہوئے تو انہوں
نے التجا کی۔ وہ اپنے وقت کا ولی تھا۔ اُس نے باطن کی طرف توجہ کی۔ ظاہر ہوا کہ اس جنگل میں ایک
سورنی نے بچے دیئے ہیں۔ جب ابر آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف منہ کرتی ہے یعنی اگر بارش ہو گئی تو بچے
تلف ہو جائینگے۔ اگر اس شہر کے لوگ انکی حفاظت اپنے ذمے لے لیں تو ابھی ابر دریا بار اُٹھے اور صحرا سیراب ہو
جب لوگ اُنکی حفاظت کو دوڑے تو اس سختی سے نجات پائی۔ یہ بھی کوئی معقول بات ہے
کہ سور کے بچوں کے لئے آدمی بے آبی سے ہلاک ہوں۔ اور جب بے پرواہی برتتا ہے تو ایک تنکا
سیلاب کی آبرو خاک میں ملا دیتا ہے چنگیز کے قتل عام میں شہر ہرات میں ایک لاکھ جانداروں میں
صرف تین آدمی بچے جو پرانی قبروں میں گھس گئے تھے ایک مسجد جامع کا واعظ اور دو اور۔ جب
فوج چلی گئی تو واعظ نکلا اور ممبر پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ آج "تنہائی" ہے اطمینان سے وعظ کہا جا سکتا ہے
اسکی آواز سن کے وہ دونوں آدمی بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ اسکو یہ بات ناگوار ہوئی کہ پھر کثرت ہو گئی

اور "تشبیہ" پیدا ہوگئی۔ اُسی وقت لٹیرے آپہونچے اور اُن تینوں کو خاک اور خون میں ملادیا
جب اس بلا نے آسمان تک سر اُٹھایا اور شیخ نجم الدین کبریٰ تک پہونچ گئی تو وہ پہنچے
کرتے کا دامن گردان کے ڈھیلے ہاتھ میں لے کے جہاد کے ارادے سے خانقاہ سے نکلے۔ اور
میدان میں آکھڑے ہوئے ناگاہ ایک خوبصورت ترک بچہ آیا اور اُس نے ایک نیزہ اُن کے سینے پر مارا۔
شیخ نے وہ نیزہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا کہ اے جوان تو سمجھتا ہے کہ میں ترکستان سے آرہا ہوں
یہ مجھ کو نہیں جانتا۔ مگر میں تجھکو خوب پہچانتا ہوں۔ وہ ہنسا اور نیزے کو زور سے اُنکے سینے
سے کھینچ لیا۔ شیخ اُسی وقت خاک پر گر پڑے اور انتقال کر گئے۔

غرضکہ خدا عجیب خود نما اور خود آرا دلبر ہے کہ اُسکی راہ میں قیامتیں برپا ہوتی ہیں اور
اُسکی طرز رفتار سے بلائیں برستی ہیں۔ اُسکے معاملات کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہاں عقل و فہم
سب بیکار ہیں۔ ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ "شاہ برہان" سات آٹھ سیر مٹھائی اپنی کملی
میں باندھے ہوئے ظاہر ہوئے۔ "شاہ مدن" نے آواز دی۔ اُنھوں نے اپنی رفتار تیز کی۔ یہ
زور سے چلائے۔ اُنھوں نے اور قدم بڑھائے۔ اُنھوں نے کہا کہ شاید تیری کملی میں کتے کے پلے ہیں
اُسنے کملی پھینک دی اور خود قبرستان میں پہونچ کر چھپ رہا۔ سارا دن کملی اور مٹھائی راستے میں
پڑی رہی۔ کتوں نے بھی نہیں کھائی آخر محلے والوں کے کہنے سے خاکروب اُٹھا لیگئے۔

دوسرے دن جب لوگوں نے شاہ برہان کو دیکھا اور حقیقت حال پوچھی تو کہنے لگا وہ شاہ
مدن گدا میرے اُسکے نسبت کیا خبر گذری کہ اُسکی زبان سے یہی نکلا۔ اگر کہیں کہہ دیتا کہ تو کتے
کی طرح کہاں بھاگا جارہا ہے تو یہ دیوانہ کتا ہو جاتا اور ویرانے میں ہر طرف ڈوڑتا پھرتا۔ میں نے
کملی اور مٹھائی سے ہاتھ دھویا۔ خدا خدا کر کے آدمی رہ گیا۔

ایک دن میں (میر) ایک بیاض ہاتھ میں لیئے ہوئے بازار میں بیٹھا تھا کہ اُس دیوانے
(شاہ برہان) کا گذر اُدھر سے ہُوا۔ اُسنے مجھ سے پوچھا کہ روح کے بدن سے جدا ہو جانے کے بعد کا کچھ
حال بھی اس بیاض میں لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں رباعیاں اور متفرق شعر

ہیں۔ کہنے لگا اگر سنو تو میں بیان کروں واضح ہو کہ لذت کسی خوش گوار چیز کے پانے میں ہے
اور الم اُسکے خلاف چیز پانے میں۔ قوائے انسانی میں سے ہر قوت اپنی استعداد کے مطابق
لذت اور الم کا ادراک کرتی ہے چنانچہ باصرہ کو محبوب کے دیدار میں اور سامعہ کو اچھی آواز سننے میں لذت
ملتی ہے۔ اور شئے مدرک جسقدر عظیم ہوتی ہے اسی قدر لذت زیادہ ہوتی ہے۔ پس چونکہ ذات و صفات
واجب الوجود سے شریف تر کوئی مدرک نہیں ہے اسلئے اُسکی معرفت سے زیادہ خوشگوار
کوئی لذت نہیں۔ جسمانی قوتیں بدن کے ساتھ زائل ہو جاتی ہیں اور قوت عقلی جو لذت و
الم کا احساس کرتی ہے نفس ناطقہ کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے۔ نفس جب تک جسم سے
متعلق رہتا ہے اسکا ادراک ضعیف ہوتا ہے۔ اور نفس مجرد اُس (خدا) کے جمال کا مشاہدہ
کرتا ہے۔ سنو نفس دو حال سے خالی نہیں یا نقص رکھتا ہے یا کمال۔ کمال کے بھی دو حال
ہیں۔ علوم یا اعمال۔ کمال علمی اُسکی قدرت کی دلیلوں پر نظر کرنا ہے اور کمال عملی نفس انسانی
کا مجرد ہو جانا۔ جو کچھ میں نے کہا یہ مقالات ہیں اور جسموں سے جُدا ہونیکے بعد نفوس
کے لیے مختلف حالات ہیں۔

چوں بمنزل برسی راہ دگر پیش آید این مپندار کہ مُردی و سخن کوتہ شد

اگر نفس بچوں اور بے عقلوں کی طرح سادہ اور پاک ہے تو لذت اور الم سے آزاد ہے۔ سادہ اور ناپاک کے
سر پر دنیا و دنیا خاک ہے کہ جسم کی کشش اس کو نہیں چھوڑتی اور وہ اس بلند مرتبہ معشوق سے کوئی ربط
نہیں رکھتا۔ پاک اور کامل خوش ہے کہ اُسکو لذت وصال حاصل ہے کامل اور ناپاک کیلئے کچھ دن
غم و الم ہے اُسکے اور معشوق کے درمیان ایک پردہ پڑ جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب وہ لوث اُس سے
زائل ہو جاتا ہے تو کریم اُسکی دوری پسند نہیں کرتا۔ اور وہ جواہر و عقول میں شامل ہو جاتا
ہے۔ ناکامل و ناپاک ہمیشہ الم ناک رہتا ہے۔ واجب ہے کہ اس جوہر علوی کو عقول
کے درجے تک پہونچا دو تاکہ اُس سے قطع تعلق کے بعد الم میں مبتلا نہ ہو۔ شام نزدیک
تھی فقیر رخصت ہو گیا اور شہر کے قریب کے قبرستان میں جہاں وہ

رہتا تھا چلا گیا۔ میں نے سُنا کہ اُسی رات کو چاندنی میں دیوانگی کے جوش میں چکر کھاتا پھرتا
تھا کہ ایک قبر کے پتھر سے ٹھوکر کھائی اور صبح ہونے سے پہلے انتقال کیا۔

چوتھی حکایت

اسد دیوانہ ایک مجذوب فقیر تھا جسکا تکیہ فیروز خاں کے تالاب پر تھا۔ اکثر رندان
باغاتی وہاں جاکے دھوپ کی تیزی سے پناہ لیتے تھے اور یہی لوگ گویا اُسکے پیش خدمت تھے۔
ایک دن میں نے سُنا کہ اُسکے تکیے میں جشن ہو رہا ہے اور جو مسجد اُسنے بنائی تھی
اُس میں لوگ ناچ رہے ہیں۔ میں گیا اور دیکھا کہ وہ لنگوٹی اور زنجیر کمر میں باندھے ہوئے ننگے بدن سب کے
بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُس نے مجھ کو دیکھا اور میرا حال پوچھا۔ جب شام ہوئی تو کھانا آیا اور سب نے
مل کے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک جوگی جسکا نام وشناتھ تھا آیا اور فقیر کے سامنے بیٹھ گیا۔
فقیر اُس سے دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ اثنائے گفتگو میں حشر اجساد کا ذکر نکلا۔ جوگی نے کہا
کہ بعث و حشر کے ثبوت میں تو بہت سی دلیلیں ہیں لیکن نفس کا اُسی بدن میں واپس آنا دشوار ہے
مثلاً آدمی مرا اور خاک ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد وہ خاک گھاس میں تبدیل ہو گئی۔ گھاس کو
کسی جانور نے چر لیا۔ اور وہ جانور انسان کی خوراک ہو گیا۔ اب اگر حشر ہوگا تو کس صورت میں ہوگا۔
اسی کے ساتھ نفوس کی انتہا نہیں ہے اور اجسام اور مادہ کی ایک حد ہے۔ اگر حشر ہوا اور مادہ
تقسیم کیا گیا تو نفوس مادے سے یقیناً زیادہ نکلیں گے۔ پھر کہنے لگا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر اتنا
جانتا ہوں کہ روح انسانی بذات خود قدیم ہے اور موت کے معنی روح کا معدوم ہونا نہیں بلکہ
قالب سے اُسکے تعلق کا قطع ہو جانا ہے۔ بعث و حشر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روح کو وہی قالب ملیگا۔
قالب ایک سواری سے زیادہ نہیں ہے۔ اُسکے بدل جانے سے سوار کا کیا نقصان ہے۔
جو لوگ قالب اول کی شرط لگاتے ہیں وہ بیہودہ بکتے ہیں۔ چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی ہم نے
رخصت چاہی اور میں اور جوگی دونوں ساتھ اُٹھے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ فقیر (اسد) اس جوگی سے باتیں کر رہا ہے اور کہتا ہے
کہ اے عزیز میں نے دل ایسے دلبر کو دیا ہے جسکا دیکھنا ان آنکھوں سے ممکن نہیں۔ بدگمانی
میرے بیقرار دل کو ہر وقت نہ معلوم کہاں کہاں لے جاتی ہے ہر شخص اسکو اپنا خدا کہتا ہے۔
ہر بے سروپا اپنے میں اسکا پتا دیتا ہے حیران ہوں کہ کیسی خصوصیت ہے نہیں معلوم کہ یہ کیسی معیت
ہے میں اپنی ہلاکت پر آمادہ ہوں اور اس خرابی سے اس خرابے میں پڑا ہوا ہوں۔ دن رات
پیچ و تاب میں رہتا ہوں مگر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر تجھے کچھ آگاہی ہو تو پریشان نہ ہو اس لئے
کہ یہاں جو کچھ ہے شوق ہے باقی سب ہیچ ہے۔ اگر شوق حد کمال پر ہے تو عاشق منزل وصال
پر ہے جس قدر شوق میں قصور ہے۔ اسی قدر راہ دور ہے۔ شوق کامل مقصود تک پہنچا
دیتا ہے۔ اور عاشق کو معشوق بنا دیتا ہے۔ انسان کا کمال معرفت ہے اور معرفت کا کمال حیرت ہے
اگر تو اسکے کمالات میں حیران ہے تو خوش حال ہے۔ اور اگر حقیقت حال کے متعلق گفتگو کرتا ہے
تو یہ عین وبال ہے۔ سُن دنیا ایک گزرگاہ ہے۔ یہ منزل نہیں ہے راہ ہے۔ لوگ قافلہ قافلہ
چلے جا رہے ہیں۔ یہاں دامن گردانے ہوئے رہنا چاہیے۔ اور زاد سفر کی فکر رکھنا چاہیے۔
ایک فقیر ہمیشہ قصر نماز پڑھتا تھا کسی نے اس سے کہا کہ قصر سفر میں ہونا چاہیے نہ کہ وطن میں۔
اس نے جواب دیا کہ ہر نفس اور ہر آن اپنے مرتبے سے گزر رہا ہوں وہ سمجھا کہ یہ طریقہ ٹھیک ہوا ہے

جائے کہ چوں نماز سفر عمر کوتہ است — بیجا بود کہ شکر اقامت کنم ہمے

ایک دن نماز مغرب کے بعد میں (میر) نے بڑی جرأت کر کے اس سے کہا کہ اے درویش
جس دن سے میں نے روحانی بہشت و دوزخ کا ذکر سنا ہے میں پریشان ہوں اور کچھ میری سمجھ
میں نہیں آتا۔ اگر آپ اسے بیان کریں تو بڑا احسان ہو۔ کہنے لگا کہ سُن اے جوان وہ بہشت اور
دوزخ جس میں قالب شریک ہے مشہور و معروف ہے۔ ایک کا حاصل ہے حور و قصور و انہار و اشجار
اور دوسرے کا زہر و زقوم و نار و مار۔ لیکن بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذت و الم جانی اس
(بہشت روحانی) کا حاصل معقولات کی دریافت اور اس راہ تمام کا مشاہدہ ہے۔ اور اس

(دوزخ روحانی) کا نتیجہ شرم، ندامت، کوفت اور غم ہے۔ حکما کہتے ہیں کہ موت کے بعد روح کے لئے لذتِ عظیم ہے۔ یا الم الیم۔ نفوس کاملہ کے لئے لذت دوام ہے اور ناقصہ کے لئے الم مدام۔ اور بہشت و دوزخ سے انھیں دو حالوں کی طرف اشارہ ہے۔

ایک دن مجھ پر بہت مہربان ہو کر کہنے لگا کہ اے جوان تیرے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سر میں فقیری کا سودا ہے۔ اس خیال سے باز آ۔ فقیری میں پہلا قدم اپنی ہلاکت میں کوشش کرنا یعنی مرگ طبعی سے پہلے مرنا ہے۔ اور دوسرا قدم خود کو نہ دیکھنا یعنی اپنے آپ کو نظر میں نہ لانا ہے۔ اس دو قدم راہ کا طے کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

ایک دن میں (میر) فقیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ اے جوان کل میں نے ایک خواب دیکھا ہے جو میری موت کی خبر دیتا ہے یعنی یہ کہ میرے پیر نے مجھ کو گلے لگایا اور جدائی کی شکایت کی۔ شاید اب زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا آپ کو سو برس تک سلامت رکھے۔ خواب محض خیال ہے۔ اس کا کیا اعتبار۔ اسی ہفتہ میں سنادی دیا کہ وہ سرسام میں مبتلا ہو کر دنیا سے اٹھ گیا۔ خدا بخشے خوب آدمی تھا۔

پانچویں حکایت

جب زمانے نے میرے ساتھ بدی کی اور مجھ کو "اکبر آباد" سے آوارہ کر دیا تو میں نے دہلی کا رخ کیا اور "میاں سعید خاں" کی خدمت میں پہونچا۔ وہ ایک مرد کامل، نیک دل، خوش خلق، سیر چشم بزرگ تھے۔ اکثر شہر کے بزرگوں کی محفل میں جاتے تھے اور بالکل آخر میں بیٹھتے تھے۔ تمام بڑے بڑے لوگ ان کا ادب کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ صفت نعال مقام صند بن جاتی تھی۔ سبزانِ نوخط سے ربط رکھتے تھے۔ کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے تھے۔ شاہ و وزیر ان کی ملاقات کے متمنی رہتے تھے۔ مگر وہ کسی کی طرف التفات نہ کرتے تھے۔ امیر لوگ بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے اور خود ہی احسان مند رہتے تھے۔ ایک نے وزیر سے چالیس ہزار

روپیہ لے کے قدم شریف کے شکستہ حوض کی مرمت کروا دی اور باقی روپیہ غریبوں فقیروں اور مسافروں کو تقسیم کر دیا۔ جب ان کی عمر پچاس برس کی ہوئی تو خلوت نشینی اختیار کر لی۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد قبرستان چلے جاتے تھے اور دوپہر کے قریب واپس آتے تھے۔ ایک دفعہ میں بھی اُن کے پیچھے ہو لیا۔ دیکھا کہ ہر قبر پر عبرت کی نظر ڈالتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ناگاہ میرے پاؤں کی آہٹ اُن کے کانوں میں پہنچی۔ پیچھے پھر کے ذرا سخت لہجے میں کہا کہ دوستی میں بہت بے تکلفی مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مجھ پر اس قدر خوف غالب ہو گیا کہ قدم اُٹھانے کی طاقت بھی نہ رہی۔

ایک دفعہ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز اپنی چادر میں باندھے ہوئے لئے آ رہے ہیں۔ میں آگے بڑھا اور پوچھا کہ آپ کیا لائے ہیں۔ کہنے لگے کہ اس محلے میں ایک بڑھیا ہے جو بڑی تلخی سے اپنی زندگی گزارتی ہے اور خاک پر پڑی ہوئی بھیک مانگا کرتی ہے اُسکے لئے اُنھوں نے مٹھائی بھیجی ہے۔ آؤ چل کر اسکو یہ مٹھائی کھلا آئیں۔ میں بھی اُسکے ساتھ ہو گیا۔ ایک بڑھیا کو سرِ راہ اُسی حال میں دیکھا۔ وہ اُسکے سامنے جا کر کہنے لگے کہ اُٹھو اور مٹھائی کھا۔ اس ضعیفہ نے مدت سے مٹھائی کا نام بھی نہ سُنا تھا کھانے کا کیا ذکر۔ گھبرا کے اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ فقیر نے وہ سب مٹھائی اس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے خوب پیٹ بھر کے کھائی اور سو رہی۔ اُنھوں نے میری طرف منہ کیا اور کہا "راحت دل ہے جہاں کہیں منزل ست و بس"۔

ایک دن بازار میں ایک کتا بھوک کی شدت میں سوکھی ہڈی کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتفاقاً ہڈی کا ایک ریزہ اُسکے دانت میں چبھ گیا اور خون نکل آیا۔ کتا سمجھا کہ یہ خون ہڈی میں سے نکل رہا ہے اور اُس نے ہڈی کو چبانا شروع کیا۔ درویش اس حالت کو دیکھ کے بے چین ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک مزدور نان بائی کی دوکان سے روٹی سالن لے کر چلا۔ درویش نے اُس سے کہا کہ مدت سے ہم تم ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ آج تک تم نے میری کوئی حاجت پوری نہیں کی۔ اگر یہ روٹی سالن مجھ کو دے دو تو بڑا احسان ہو۔

وہ درویش کو پہچانتا تھا۔ بولا قربان جاؤں۔ جان جو دنیا میں سب سے پیاری ہے آپ کے لئے وہ بھی عزیز نہ کرتا۔ روٹی سالن کیا چیز ہے مختصر یہ کہ وہ روٹی سالن اُس نے کر کتے کے سامنے رکھ دیا۔ سچ ہے جو لوگ دل میں اوکھتے ہیں وہ کتے کی بھی دلجوئی کرتے ہیں

ایک دفعہ برادر گرامی قدر "محمد حسین کلیم" نے شکایت کی کہ بے روزگاری سے سخت پریشان ہوں میرے لئے بھی کبھی کوئی مراعات ہو۔ یا کسی کو اشارہ کر دیا جائے کہ زندہ تو رہ سکوں۔ کہنے لگے کہ مراعات کا شکوہ بجا ہے لیکن میرا اختیار کیا ہے۔ رہا کسی سے کچھ کہنا، تو یہ بات وقت پر موقوف ہے۔ انھوں نے اُسی رات کو خواب میں دیکھا کہ درویش نے اسحٰق خاں شہید کے چھوٹے بھائی "مرزا محمد علی" سے میری نوکری کے لئے کہا اور اُنھوں نے منظور کر لیا۔ وہ ہی تین دن کے بعد وہ چالیس یا پچاس روپے کے نوکر ہو گئے۔ اُنھوں نے یہ معاملہ درویش سے بیان کیا۔ کہنے لگا کہ خواب پریشاں کا کیا اعتبار۔ الحمدللہ کہ تم کامیاب ہو گئے۔

باوجودیکہ وہ یاد الٰہی میں محو رہتے تھے پھر بھی شعر و شاعری سے خاص ربط رکھتے تھے۔ ایک دن صبح کو مجھے بلا بھیجا جب میں حاضر ہوا تو کہا کہ خفقان کی شدت ہے طبیعت کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ کچھ عاشقانہ شعر پڑھو کہ میں تقویت دوں۔ اتفاقاً یہ شعر میری زبان سے نکلا۔

صبر پیش دل نو شکیب من باش   کہ از برائے تپیدن بہانہ می طلبد

انھوں نے ہاتھ دل پہ رکھ لیا اور غش ہو گئے۔ لوگ اُنکو اُٹھا کر گھر میں لے گئے۔ وہ پھر باہر نہ نکلے وہ تین دن عجب حال رہا۔ کبھی غش کبھی افاقہ۔ آخر گزر گئے۔ خدائے کریم اُن کو بخشے اور غریق رحمت کرے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد و ثناے قادر سخنے کہ بہ یک حرف جریدۂ عالم را از قلم و عدم بہ صفحۂ ہستی جلوہ داد۔ و تحیات زاکیات ایمئے کہ آشنا بہ حرف منفصل نبود و اول بسم اللہ سر بجہان معنی نہاد۔ میگوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسرم ذوق خواندنِ ترسل پیدا کردہ بود لہذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار را بانذک فرصت نگاشتم۔ و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گذاشتم۔ ہر کہ ایں حکایات خمسہ ابدل بخواند غالب کہ در رنج و سختی نماند۔

حکایت

روزے با درویشے شاہ ساہا نام مستغرق شوق صبح و شام حالاتش اسنہ مذکورہ بشیر آہو خانہ مشہور برخوردم۔ التفات بسیارے کرد و گفت کہ اے جوان در چہ خیالی کہ ایں ہمہ پریشان حالی دگرآں سراپا تا بسرے داری باید کہ بخود نظرے داشتہ باشی۔ باآں ہمہ تنزہ و تقدس علاقہ بدارد کہ او را از تو فرق نتواں کرد۔ ایں

نیست کہ پیدا نیست یا ایں جا ہست و آنجا نیست۔ ہر چند از کمال ظہور حسن چوں آفتاب نصف النہار در حجاب ست اما کدام ذرہ از ذرات عالم دیدہ کہ بے پرتو آں آفتاب ست۔ زماں زماں بیندیش و بخود فرو رو مقصود تو نی بکام جاں اصل شوے

جُدا از خود چہ میجوئی توہم کردہ مہجورت اگر معنی ہمیں معنی و گر صورت ہمیں صورت

شامگہ مشکیزہ بر دوش گرفتہ بباز ارمی آمد و آواز میداد کہ اے خشک و ہا نان ساحل دریائے کم آب ہستی اگر شما کسے لب ترکردنے منظور دارد خوش باشد۔ ہر گاہ مردماں بر و گرد می آمدند کسے را شربت شکر جام و کسے را پر از شیر جام میداد۔ ریا کارے بنود آب در شیر نمی کرد۔ قدم پیش می نہاد۔

یکے پاسے از شب گذشتہ روے سخن بسوے من کرد کہ اے عزیز اگر نان جو ایں دست دہد ایں پیر ضعیف سیر خورد۔ چوں برخاستم گفت کجا۔ گفتم موافق اشارہ کار بند میشوم۔ گفت ابرو اما گماں نخواہی برد کہ نان میگویم و جان میدہم۔ من شیرم شکم را نان شما طائی کنم۔ نان گریہ را بہ تیر میزنم۔ گفتم استغفر اللہ ایں چہ معنی دارد۔ آب بر دست چوں در ویشے ریختن نان پختن است و نان بخون تر شدن اینجا نان بروغن افتادن۔

دمے کہ بخانہ آمدم دیدم کہ مردمان ہمہ در خوابند۔ مگر کہنہ داہے کہ غلط و اغلط میکرد۔ التجا با و بردم۔ آں مردہ شو بردہ بعد رکیدن بسیار نان پختہ بدست من داد۔ چوں پیش فقیر بردم۔ گفت کہ ایں نان قابل خورد آدمی نیست۔ بر ایں مادہ سگے عفنے کردہ است۔ زود از ینجا بردار و پیش سگاں بینداز۔ غرض کہ او ہر گز نخورد و مرا ایں معنی

از ہوش برد۔ عجوز روغن فروشے معتقد داشت۔ اکثر چرب بانی بکار می برد۔ پارۂ نانے دم از خانہ اش میخورد۔

یکے بر فقیر حالتے بود بند از بند جدا سر معلق در ہوا۔ آں سال خوردہ بسر وقت او افتاد۔ واز مشاہدہ ایں حالت فریاد برآورد کہ اے اہل محلہ کسے میاں ساہار کشت ہنگامہ برپا شد۔ درویش از شور و غوغا ازاں بحالت بحال اصلی خود آمدہ ہر دو دست برزمین زدن و نفریں کردن آغاز نہاد۔ کہ از ہر کہ ایں راز بر روے روز افتاد من مجروح را بخیہ بر چہرہ رفت امشب بسپرا و راخون بگیر و خود ش بخواری بمیرد۔ ناگہاں آتش در افتد رسم باش و بود برافتد۔ از من آثار نماند۔ اینجا دیار نماند۔ آبادی غیرت وادی شود مار بعصا راہ رود۔ مردماں تباہ۔ خانہا سیاہ۔ ازیں سرتا باں سرویرانہا ایں باہم نشستنہا افسانہ۔ محلہ را آب برد۔ اینجا تو نبرد۔ دریں میاں روز باخر رسید۔ دست و تن باب کشید۔ قصد نماز دیگر کرد و بلطف با من سر کرد کہ اے عزیز امروز پیش از شام برو۔ موجب تشویش فقیر مشو۔ محلہ محل نزول حادثات بنظر می آید۔ قریب است کہ عافیت ابنیہ و بلا رونماید حاصل کہ مرا دل دادہ در فکر نماز افتاد۔

چوں شب پردہ ظلام فروہشت۔ قریب دو صد دزد بسر ہنگی تمام شمشیرہا کشیدہ درآمدند۔ و دو سہ کس کمندہا انداختہ بالاے بام عجوز برآمدند۔ پسر خوان گرفتہ او خود را بر روے آنہا کشید۔ و بہ یک ضربت تیغ آہنگیری کردہ بخاک و خون غلطید۔ مشعل افروختہ خانہا را آتش دادند۔ و بخاطر جمع دست غارت کشادند۔ کسے روے غربا ندید

کار بتماشی کشید۔ تا دل شب کل محلہ بود بنگر در و سیہ رو نمود۔ وقتے کہ ہنگامہ فرو شد یعنی دزداں خانہا را پاکردہ بردند کساں از فرط ہراس محلہ را خالی گذاشتہ بدر زدند ہنوز جائے باش مقرر نشدہ بود کہ ابر سیاہ سفید شدہ پہن گشت۔ و در یا در پایاں دین گرفت۔ بنائے نماند کہ بآب نرسید۔ متاعے نیافتند کہ آب ندید۔ مردماں مانند آب باراں برائے نجات دست و پا میزدند۔ اما از شدت بارش ہر لحظہ نومید تر می شدند۔

ابر تر از بس تر بہا می نمود ہر یکے از خوف جانت خشک بود

پاسے برایں نرفتہ باشد کہ صحرا صحرا آب از دشت رو بشہر آوردہ اکبر آبادی را برد۔ و بہ یک قدرگاں ہم زدن عمارات آں محلہ برہم خورد۔ خانہا نشستند۔ دیوارہا شکستند۔ چوں آب را زمیں فرو برد از در و بام نشانے نیافتم۔ از بناہا آثارے ندیدم۔ تلاطم امواج و تصادم ہوا مکانات را بخاک برابر ساخت۔ کف دست میدانے بود کہ نگاہ بے حایل نشیب و فراز تا چشم کار میکرد میرفت۔ عبرت دست ہم داد کہ ایں قسم معمورۂ درق از دل بر در عرصہ یک ہفتہ صحرائے لق و دق شد۔

حیران کار راہ تکیہ فقیر پیش گرفتم۔ در اثنائے راہ نگاہم براں پیرزن روغن فروش افتاد۔ کہ بسان سر نشیناں پامال ذلت و خواری افتادہ پیش کس و ناکس روی انداخت گفتم حرف دریوزہ است کہ دست در روغن داشتی۔ پسرت جواں چرپیے بود۔ چہ واقع شد کہ دفعتاً بہ چنیں بلا مبتلا شدی۔ تو خود سر دستے بھر کس میگرفتی۔ چہ کردی کہ بجزاے آں انگشت نما شدی۔ دم سرد بر آورد و گفت کہ اے عزیز چگویم تفصیل

لطف ندارد ۔ نفرین فقیر خداگیرم ساخت ۔ آسمان روئے مرا بر خاک انداخت ۔ اگر با او برخوری ازیں خاک افتادہ بگو کہ ناکشیدنی ہا کشیدم ۔ بسزائے کردہ رسیدم ۔ اکنون عذر مرا بپذیر ۔ از خاک ذلت برگیر ۔

دعائے کن کہ جان آن بگسل را دعا بگویم ۔ رحم آر کہ چارۂ کار از مرگ بجویم ۔ زندگانی مرگ ست مردن نیست یعنی طاقت ستم کشیدن نیست ۔ گفتم دل جمع کن اگر وقت مساعدت میکند با او میرسانم ۔

یک تیر پرتاب رفتہ باشم کہ تیر پائے کچہ پن کردہ چناں یا وتند رسید از شاہ راہ کنارہ کردم و بالا بالا بتکیہ آمدم ۔ دیدم کہ فقیر جامہ بیری بر دارد و بر پوست شیر نشستہ است ہیئت ہیبت ناکش چناں در من اثر کرد کہ پایم از پیش بدر رفت ۔ ہر طرف از چشم آتش فشاں بوجہے میدید کہ بیننده را زہرہ آب میگردید ۔ پرسید کہ از کجا میرسی ۔ التماس کردم کہ برائے سیر تعزیہ تازہ رفتہ بودم و بآن ال ضعیفہ نیز ملاقات نمودم نعرے درہم کشید و گفت گپ دیگر بزن ۔ مارے رفتہ است کار او خواہد ساخت ۔

پس از ساعتے خبر رسید کہ عجوزہ روغن فروش را مار گزید ۔ چوں من حیران این واقعہ ماندم و برنگ نقش دیوار سخن نزادم گفت چہ عجوبہ فرو رفتہ ۔ امشب ہمان مار این روسیاہ را نیز خواہد گزید ۔ حیران تر شدم و گفتم این چہ حالت است ۔ گفت اگر نشنیدہ کہ غضب فقیران آتش می افروزد ۔ خشک و تر ہر چہ در وی افتد می سوزد ۔ فرصت عمر من کم و حال بسیار درہم ۔ دو سہ حرف بشنو یا دگیر و برو ۔

گفت کہ اے عزیز دنیا کاروانگاہ دلکشے است - ازینجا بجز حسرت ہمراہ نمی رود حیف اوقات آں عزیز کہ زود آگاہ نمیشود - شیرانہ بزی وبکار گور بپرداز وقت کہ چوں آہو گرم رم است ضایع مساز - افلاطوں باآں کمال غریبانہ زیستے وزماں زماں زار گریستے - شاگردے پرسید کہ سبب گریہ ظاہر نمیشود - گفت اے نافہم کسے کہ چوں مرگ استحالہ در پیش داشتہ باشد چرا نگرید - ؎

خندہ می آید چہ می پرسی سبب گریہاے زار مرا

بدانکہ آں سرمایہ جان کہ مقصود دلہاست آئینہ در پیش دارد - وسرے باخویش - گرم تماشاے خود است ومحو سراپاے خود - اگر بر آسمان ہفتم روی بے پرواست - در خاک شوی ہماں گرم استغناے بے رنگی او رنگہا دارد وساز وحدتش آہنگہا شفق یاد میدہد از رنگ آتش - گل میگوید کہ گل بجالش - در پردہ کثرت نواسازی میناید - از شش جہت آوازہ می آید - حرف مرگ میگفتہ باش - بگورستاں ہمی رفتہ باش - تا از فنا خود غافل نشوی وبہ لعب طفلانہ مائل نگردی - بروشام است وراہ پرگل - بر اتشویش رفتنے در دل - امید کہ صبح بر جنازہ من بیائی - حق صحبت دیرین فراموش ننمائی مجال تکرار نیافتم - نومید برتافتہ آمدم - از درد غم پیچ نخوردم - شب در تلواسہ بسر بردم - ہنوز خیط الاسود از کنارہ ذارقبہ سبز فلاک کہ چنیں ہزار مار مو بزیر سر خود را انداں نمایاں دارند فروتہ نشتہ بود - شب بے بر خواست کہ شیر آہوخانہ را مار گزید وہلاک گردید - دل از چارہ رفت طاقت از پا رفت - اسپ از خانہ آشناے طلبیدم -

عنان دل از دست دادہ رسیدم۔ غم جانگزا بود گداز گشتم۔ اشکباریزاں شریک نماز گشتم۔ جنازہ کشاں کہ خدایاں شدند۔ دو خوانندہ نمایاں شدند۔ ایں بیت اسفرونہ بیطاقت ترنمودند ؎

همرہ نعشم بیا یا بہ سر تربتم　　　　باز غنیمت ندانید دو سہ گامم دگر

گریاں گریاں مردہ او را بردند و بجز اینہ تازہ بخاک سپردند۔ چہ نویسم کہ از مرگ فقیر چہ قدر ملالت کشیدم۔ وازنا گہیری از قم روزگار چہ حالت یا ہما سینہ من تفت سالہا از خاطر رفت۔

حکایت

شنیدم کہ در خرابہ ممتاز گنج کہ محلہ ایست از اکبر آباد درویش دلِ غم سودا بسر موئے ژولیدہ تا کمر از دور چوں تیر خاکی گرد میکند وازبس وحشت چوں شکار دور گرد۔ گاہ بہ چشم می آید وگاہ پنہان میگردد۔ مشتاق شدہ اندازدیدنش کردم۔ اتفاقاً ہمانے ز راہ او از ویرانہ ببازار محلہ مذکور افتادہ بود۔ دیدم کہ چوں گرد باد وحشت آمادہ میرسد۔ و بازاریاں دیوانہ بے سر و پایش قرار دادہ سنگ باراں مینمایند۔ او میگوید کہ چوب شما در آب ست۔ مبادا کہ آسیبے بما برسد وایں محلہ پاک مسوزد۔

چوں بحث بطول کشید سنگے بدوشش رسید۔ پرکالہ آتشے از ہوا در انبار پنبہ افتاد شعلہ برخاستہ پہن شد و سر ببازار نہاد۔ بیکدم ہنگامہ آتش چناں گرمی پذیرفت کہ دست و دل بازاریاں سرد شد یعنی آن قدر آب کہ ایں آتش تیز را فرو نشاند۔

بهم رسید۔ سنگ و چوب و خشت و غله همه خاکستر گردید۔ خورد و کلاں در فکر خویش
افتاد و فقیر دریں فرصت قدم کشاد۔

باندک زمانے برلب دریا آمد و نشست۔ دریا طرفه دریاے بجوئے خود بست
هر دو پا در آب در آویخت۔ دریاے بدریا آمیخت۔ منکه پا بپا و دیده آمده بودم پیش
رفتم و روے خود نمودم۔ دیدم و پرسید متفحص تام شدم به جرأت تام۔ گفتا احسن دتمر
ولقب رام۔ گفتم وطن۔ گفتا دکن۔ گفتم چه پیش آمد که اینجا رسیدی۔ گفتا همیں آوارگیها
کرد دیدی۔ گفتم دست و دهن گرد آلود بشو و با من اندکے واضح تر بگو۔

چوں سماجت من نظر کرد ناچار حرف سر کرد۔ که اے عزیز جوانی بود شور در سر
داشتم۔ شبے از خانه پا بیروں گذاشتم۔ قلندرے جگر کبابے در بازار گریه کرده به نظر
در آمد۔ شیر قلاب سیمین خود را که به پنجه او از اتفاقات شکستے رسیده بود به دکان زرگر درست
میکنانید۔ سبحه در دست داشت متصل میگرداند و به حسرت تمام ایں تسبیح را میخواند که
"سبحان من لیس للخلق الی معرفته سبیل" بسیار به دلم خورد۔ دست در گریبان زده
از شهر بر آمدم۔ و چوں غبار سراسیمه بدامن کوهے در آمدم۔ چندے دراں سنگلاخ
سخت خوردم۔ دنداں بر جگر افشردم۔ غذا برگ تر کردم۔ به ایں بسر کردم۔ روز و
شب زار نالیدم۔ روے بر خاک مالیدم۔ حرف نگفتن گرفتم۔ ترک خفتن گرفتم۔ دیوانه وار
گشتم۔ یعنی بسیار گشتم۔ سر را به هر سنگ زدم۔ صد مرده فریاد شدم۔

یکے بعد از نماز صبح ایں روسیاه جلگی قبح بر تخته سنگے نشسته بسبیل تپا برگ

درختانِ سبز رامی خورد۔ ناگاہ سیاحت پیشہ سراپا اندیشہ۔ در راہ خدا خود گم ریشش جو
و گندم چیکن در بر چتر طاؤس بر سر۔ از جانب دست راست پیدا شدہ گفت کہ
تہ داران تنہا تہ بندی نمیکند۔ از تنک روئی جواب ندادم۔ بر تختۂ سنگ جا کشادم۔
دو سہ برگ تنا ول نمود۔ لحظۂ آسود۔ و فرمود کہ اے عزیز بگر دل دادہ آں یار پریشاں
اختلاطی کہ جائے او در ہر دل پیداست۔ وار فتۂ آں قیامت خرامی کہ سراسر برائے
خویش ست و پیش خود بر پا آں سرمایہ ناز نگیں بہ فتنے دارد کہ از طرز رفتارش چمن چمن
جاں میبارد و استغنائیش بحدیست کہ اگر از باد دامن بلندش جہانے برباد رود پروا ندارد
در جائے کہ نخس پہلو می دہد محیط اعظم را کے رو می دہد۔

یار ما آں دارد و ایں نیز ہم

از لب ہائے شکر نیش بسبب تلخی ناکامی دل زدہ نباید شد کہ نومیدی را دوست نمیدارد
آن چرکالۂ آتش یعنی تجلی جلوۂ من در نے بست چنیں عاشق قدم نمیگذارد نومیدی
از برائے چہ مقصود دہمکنار است۔ ولتبنگ چرا نشستہ کہ عالم ہمہ یار است۔ بخیز
و سیاحت کن۔ خوش باش و فراغت کن۔ برخاستم ہمراہ شدم۔ آگاہے بود آگاہ شدم۔
روزے در نواح گوالیار تکیۂ فقیرے را منزل نمودیم۔ و در میاں ہر دو صبح
مشغول بر کعت منفردہ وتر بودیم۔ ناگاہ طوطی قفسی کہ زباں دادہ صاحب آں مکان
بود دو وسہ بار سبحان اللہ بجز ن تمام گفت۔ غیرت عشق در من حالتے نہ گذاشت ہوش
از سرم دست لطف برداشت۔ سیاح آب بر چہرہ ام زد۔ طاقت رفتہ باز آمد گفت

چہ بود۔ گفتم ذکر کردن طوطی بردماغم خورد۔ غیرت عشق از جایم برد۔ گفتا آں محبوب را نیز بہ عاشق ہمیں معاملت است۔ اگر او را مشغول بغیری بیند با ایں بدل نزدیکی دوری میگزیند۔ فتنہ با بپاے او برسرش میدود۔ نے نے بلکہ تا کشتن ہمراہ میشود۔

درویشے از کلبۂ تاریک خود گاہے بدر نمی آمد۔ روزے معتقدے گفت کہ شبہائے ماہ در سواد ایں شہر مہتاب خوب میشود۔ اگر چشم آب دادہ آید خالی از کیفیت نیست۔ آں مست شراب معرفت تکلیف او را بر خاک نینداختہ رفت۔ ہنوز چشم وانہ کردہ بود کہ ترکے خنجر کشیدہ در دست رسید۔ و پرسید کہ فلاں کس توئی گفت بلے۔ گفتا ترا مستجاب الدعوات میگویند۔ غلام من خورجین پر از زر گرفتہ گریختہ است دعاے کن کہ پیدا شود۔ ورنہ می ستیزم و خونت می ریزم۔ درویش از نہ کار خیر بود دانست کہ آں ہمہ ناز و عتاب را کہ ہردم از خود حساب دارد بے یاد چہرۂ مہتابی خود نشستن من در مہتاب خوش نیامد۔ بسیار متنبہ شدہ باں ترک گفت کہ پیشتر از صبح صادق بر لب دریا برو سفینہ کہ اول آب انداز ند برو سوار شو۔ انشاء اللہ بمراد خواہی رسید۔ ترک رفت و ہمچنیں کرد۔ غلام را معہ زر در ہماں کشتی یافت درویش ازاں باز بر نیامد۔ ترک ملاقات کرد۔ تا آنکہ مرگ طبیعیش رسید و وفات کرد۔

ہرگاہ قصد پیشتر کردم سیاح پیش آمد و گفت کہ من تلاش با ایں افتادگی پس از خرابی بسیار چوں تو دوستے را از صحرا یافتہ ام۔ حیف است کہ از دست ہم اما ازیں سجادہ پانزدہ کروہ قصبہ ایست مشہور بہ باڑی قدمگاہ پیر من آنجاست۔ اگر

برائے چند روز دل دہی رفتہ چراغ افروزم و سعادت دارین اندوزم۔ گفتم خدا ہمراہ او

باآں طرف حرکت کرد و من در خرابۂ گرد ایں شہر آمدہ ساکن شدم۔ مدت دو ماہ بہ تنہائی

بسر بردم۔ امروز از وحشت و بشہر آوردم۔ عوام کالانعام اینجا تشنۂ خوں شدند۔

لنگر از کف دادہ بدر یار رسیدم۔ اکنوں دل بہ دریا افگندہ منتظر اشارۂ آں طرف نشستہ ام۔

چوں شام خندید مشغول نماز گردید۔

دم صبح باز بخدمت او رسیدم دیدم کہ ہماں طور نشستہ است طعام با خود داشتم

پیشش گذاشتم۔ دو سہ لقمہ خورد و دست برد۔ گفتم طشت و آفتابہ حاضر است۔ و غلام

موجود۔ گفتا من درویشم مرا در شدا اینہا نبایدبود۔ مگر گفتہ مولانا کاتبی بکا غذے نبشتہ۔

در قصر لاجوردی خطیست بر کتابہ ... کاے بے زراں چہ حاصل از گنج در خرابہ

پایان کار باید از جملہ دست شستن ... گر ماہ طشت داری ور مہر آفتابہ

گفتم بوریائے برائے فرش آوردہ ام۔ گفت من با خاک سرے دارم۔ گفتم ردائے نو

بہم رساندہ ام۔ گفت ایں بار را بر دوش نمیگذارم۔ گفتم کاسہ برائے آب خوردن خریدہ ام۔

گفت کاسۂ سر شکستہ ام۔ گفتم قدر قلیلے برائے خرچ با خود دارم۔ گفت دل با ہیچ نبستہ ام۔

گفتم چیزے ازیں قبول شود۔ گفت میخواہی کہ فقیر ملول شود۔ دیگر دم نزدم یعنی ساکت شدم۔

دراں زماں زنے جمیلہ چہرہ رنگ۔ شوخ و شنگ۔ از قبیلۂ چیت سازاں

ساعد چہ گلی بر دوش۔ آفت صبر و ہوش۔ با چہرہ آراستہ۔ چوں سرو نو خاستہ۔ بہ بہانۂ

آب صبح و شام ہمراہ از دحام بر لب دریا می آمد و خبر بی خودی می نمود۔ عالمے دیوانۂ او

بود۔ بہ سر زلف حرف زناں۔ پشت چشم نازک کناں۔ با فقیر چہرہ شد۔ گفت کہ اے رہزن دین و دل این ہمہ خود را گم کردن۔ برو رام رام میگفتہ باش۔ مجرد شنیدن لباس درید۔ خاک لب آب بر رو مالید۔ موے سر پیچیدن گرفت۔ رام گویان دویدن گرفت۔ آخر دل ہگی خوں شد۔ وہ مردہ کار جنوں شد۔ چند روز ہیچ نخورد۔ بہ ہماں حال جان سپرد۔

چوں ایں خبر رسید پشت دست گزید۔ گفتم ایں چہ رو نمود۔ گفت مقدر چنیں بود۔ ہیچ جرم فقیر نیست۔ از مقدر گزیر نیست۔ نشنیدہ کہ درویشے را آزار شد۔ چوں سخت بسیار شد یعنی بیماری رو تبز آید آورد طبیب در پرہیز مبالغہ از حد برد۔ گفت کہ اے زیادہ سر از مقدر یا از غیر مقدر۔ غیر مقدر بمن نخواہد رسید۔ از مقدر دست باز نخواہم کشید۔ دو سہ روز دیگر دیدہ شد۔ روزے از یکے شنیدہ شد کہ آں قلندر دو سہ دنگے بہ یک دم زد و از سر دریا گلبانگ بر قدم زد۔

حکایت

دلیل راہ عرفان میاں شاہ برہان دست از دنیا برداشتہ۔ قدم براہ فنا گذاشتہ۔ آوارۂ منزل رسیدہ۔ گلیم سیہ سر در کشیدہ۔ سفید گو و برہنہ تن با معنی در یک پیراہن۔ ہر گاہ بہ شہر آمدے سنگ بسنگ می زدے۔ روزے در سواد شہر بنظر در آمد۔ دیدم چیزے کردی شکل بغایت براق در مقدار قریب نیم آثار بدست در سایہ درختے نشستہ

هر دمش می بیند۔ گمان بردم کہ سیم شاخ دار لیست۔ آخر پرسیدنے کردم کہ چہ می بینی۔ گفتا بقول مرتضیٰ علی علیہ الصلوٰۃ سیم ہم عجب چیزیست۔ وے کہ از دست میرود نفع ایں برداشتہ میشود۔ گفتم تو فقیر سیم آوری۔ پروائے نداری۔ ایں سیم دست افشار را بمن بدہ۔ گفت اے خام دست دل براین منہ۔ سیم روپوش بکار نمی آید۔ برائے نان نجیتن سیم خام می باید۔ گفتم ترا چہ کار۔ گفت بیا و بردار۔ چوں پیش رفتم از دست گذاشت۔ و گلیم سیاہ خود را برداشت۔ دست بگلیمش زدم کہ مشتاب۔ وے ایں سیہ گلیم را دریاب۔ بارے دلم نشکست۔ خندید و بنشست۔ پس از دلجوئی و مزاج گوئی گفتم کہ اے پیش دامن دیوانگی کردنت خردمنداں۔ وائے دنیا گردند موسیت مشکیں کمنداں۔ امروز گرد آلود از کجا آمدہ بودی۔ گفت من اللہ۔ گفتم کجا خواہی رفت۔ گفت الی اللہ۔ گفتم بچہ سرمایہ در صحرا بسر می بری۔ گفت سرمایہ دنیا و آخرت چوں من بے سروپا غیر اللہ کہ میتواند شد۔ گفتم ہرگاہ از دور پیدا میشوی سنگ بسنگ زناں می روی۔ ایں چہ انداز ست۔ گفتا سنگ بسنگ زدن کنایہ از خراب کردن است۔ بدانکہ آبادی بیرون شہر ویرانہ خواہد شد۔ وایں صحبتہا افسانہ آنچہ گفتہ بود قریب رونمود۔

روزے شاہ مدن قلندر برہنہ تن۔ معاصر او کہ فقیرے بود قامت کشیدہ۔ درویش درویشاں دیدہ۔ مردے صاحب حال و باکمال۔ چہرہ دوسہ کو چک ابدال۔ قلندرانہ بسر بردے۔ جز نان جویں نخوردے۔ شب آدینہ در تکیہ او کہ متصل مدار دروازہ دشت سیم نبدی بیکردند۔ خلقے برائے سیر چراغاں می رفت۔ صبح آں

بہ گدائی بر میخاست۔ غیر فلوسے از کسے نمیخواست۔ بہ بہ بزبان راندے ایں بیت استاد بر خواندے۔

آوردن زر بدست آسان نبود — خوابیدہ بروئے ہر فلوسے شیرے

یکے بہ نخاس کہ در ہندوستان جائے فروختن اسپان را میگویند آمد۔ وپیش را نقے نشست۔ اتفاقاً من نیز نشستہ بودم۔ بخاطر گذشت کہ مرا با ایں فقیر سابقہ معرفتے نیست۔ ودمن صحبت ہم ندارم۔ اگر خود بخود خدا گوئی سرکند دانم کہ صاحب کمال مقرریست۔ لحظہ برایں نرفتہ بود کہ بداں خطرہ مشرف شدہ سرکرد کہ اے عزیز کسے را کہ اللہ میگویند من و تو ہمہ اش میجوئید۔ او عجیب فتنہ گریست و غریب خودسریست۔ بجائے کہ پروا می کند گل تر بر خاک می زند۔ ادنیٰ اعلیٰ را وجود نمیگذارد۔ مو ضعیف پاس دارد۔ وقتے در مصر خشک سالی افتاد۔ چہ دلبراں کہ ہلاک نشدند۔ چہ کساں کہ خاک نہ گشتند۔ چوں اہل شہر سخت خوردند التجا بذوالنون بردند۔ او ولی وقت بود توجہ بباطن نمود۔ ظاہر شد کہ دراں صحرا مادہ خوکے بچہا آوردہ است چوں ابر می آید رو بآسمان می نماید یعنی در صورت بارش ایں بچہا تلف میشوند اگر ئیس اینجا ہمت بحفظ آنہا بر گمارد ابر دریا بارے برخیزد و صحرا صحرا ببارد۔ ہرگاہ برائے پاس آنہا شتافتند ازاں بلائے صعب نجات یافتند۔ ہیچ معقول است کہ برائے بچہ ہائے خوک تو باں تلف نشوند۔ و آدمی روشاں از بے آبی برباد فنا روند۔

در جائے کہ بہ سبب پروائیہا می پرواز دخس از تری روے سیل بخاک می انداز

در قتل عام چنگیز که پاسے حکم از رستخیز نداشت بشہر ہرات که صد ہزار جاندار بود تیغ قتل رسید ند۔ مگر سه کس که بگورہاے کہنه خزیدند۔ یکے واعظ مسجد جامع و دو کس دیگر۔ چوں فوج رفت واعظ برآمد و بر منبر نشسته سر کرد که امروز تنہا ہمه است۔ وعظ با دل جمع تواں گفت۔ از شنیدن آواز آشنایش آں ہر دو نیز بمسجد در آمدند۔ بیدماغ شد و گفت که باز کثرت شد و تشبیه میاں آمد۔ درہماں حال غارتیاں در رسیدند و آں ہر سه تن را بخاک و خوں کشیدند۔

وقتے که ایں بلا سر بآسماں کشید و به شیخ نجم الدین کبریٰ رسید دامن قمیص بمیاں بر زدہ سنگ در دست بقصد جہاد از خانقاہ برآمد۔ و در میدان بایستاد ناگاہ ترک بچه خوش رو شوخ چشمی تمام رسید و نیزہ خطی بر لوح سینه اش زدہ گفت که تکبیر و بمیر۔ شیخ آں نیزہ را بدو دست گرفته سخن زد که اے جوان سادہ۔ کیں آمادہ کلاہ ترکی بر سر۔ کمر زریں در کمر۔ سنان آبدار در دست۔ نیم ہشیار و نیم مست۔ میدانی که از ترکستان می آیم ایں مرا نمی شناسد۔ بلے من ترا می شناسم ؎

اے نو بہار باغ جفا می شناسمت وارے ہزار رنگ قبا می شناسمت

او خندید و نیزہ را نبرد و راز سینه اش برآورد۔ شیخ ہماں دم بر خاک ہلاک بیفتاد و بمرد۔

غرض که خدا طرفه خود آراست۔ عجیب دلبر خود نماست۔ گرد راہش قیامت انگیزد۔ طرز خرامش بلا ہا ریزد۔ کار او ہیچ به فہم در نیاید۔ دانش اعتراف بعجز می نماید حیران کار خردمند۔ در عجب دقت پسند۔ او سر گرم کار۔ فکر در آزار۔ آگاہ ناگاہ۔ دلیل

گمراه - ادراک و فهم اینجا همه وہم -

سخن اینجا بود که قریب ہفت ہشت سال از آثار شیرینی و گلیم سیاه خود بسته شاه بربان پیدا شد - قلندر را آواز داد - او قدم تیز کشاد - این ہوسے کشید - او گرم دوید - ونگے زده گفت که مکر و گلیمت سگ بچگانند - او انداخت و خود را بگورستان رسانیده پنهان ساخت - تمام روز گلیم و شیرینی در راه افتاده ماند سگان ہم نخوردند - آخر بگفته اہل محله کناسان برداشته بردند - روز دیگر که بربان را دیدند حقیقت حال پرسیدند - گفت که او شاه و من گدا نسبت میان من و او - بخیر گذشت که از زبانش این قسم بر آمد - اگر گفتی که مثل سگ کجا میری استخوان چه بشکنی چه می دوی - این دیوانه سگ می گردید و در خرابه بهر سوی دوید - از گلیم و شیرینی دست افشاندم - خدا خدا کرده آدمی ماندم -

روزے بر سر بازار جزدیاضے در دست شسته بودم که آن دیوانه تمام اجزا بدست من افتاد - گفت که درین سفینه چیزے از حال نفوس انسانی بعد مفارقت بدن ہم نوشته اند - گفتم که درین نسخه رباعیات است و ابیات متفرقه - گفتا اگر گوش بنداری من بگویم - گفتم لطف کن - گفت بدانکه لذت دریافتن چیزے ملائم است والم دریافتن چیزے منافی آن بهر قوتے ازقوت ہاسے مدرکات لذت والم است بحسب آن قوة - چنانکه لذت باصره در دیدن محبوب لذت سامعه در سمع آواز خوب چندانکه مدرک عظیم تر لذت قوی تر - وگر از اضداد است رنج والم زیاد است چون ہیچ مدرک شریف تر از ذات و صفات واجب الوجود نیست پس ہیچ لذتے لذیذ تر

از معرفت او نباشد۔ و قوتہائے جسمانی با ابدان میروند یعنی از فنائے آں باطل میشوند۔ قوت عقلی کہ لذت والم رامی داند بانفس ناطقہ باقی می ماند۔ ادراک نفس متعلق ببدن قاصر۔ و مجرد در مشاہدۂ جمال او ناظر بشنو کہ نفس ناگزیر است از دو حال۔ یا نقصان وارد یا کمال۔ کمال رانیز دو حال است۔ یا علوم است یا اعمال آں علمی در دلائل قدرتش نظر۔ عملی مجرد گشتن نفس بشر۔ اینکہ گفتم از قبیل مقالات است۔

نفوس را بعد ابدان حالات ست ؎

چوں بمنزل برسی راہ دگر پیش آید　　　　این مپندار کہ مردی و سخن کوتہ شد

اگر سادہ و پاک چوں نفوس اطفال و ابلہانست از لذت والم برکرانست۔ بر سر سادہ و ناپاک جہاں جہاں خاک یعنی جاذبۂ بدنش نمیگذارد و بمعشوق اعلیٰ ربط ندارد۔ شاداں پاک و کامل کہ لذت وصالش حاصل۔ کامل ناپاک چندے در الم یعنی باغم۔ اینجا شوق انجاہم۔ حجاب میان معشوق و او حایل گردد۔ پس از دیرے چوں آں لوث زائل گردد کریم دوری او نہ پسندد۔ با جواہر و عقول در پیوندد۔ ناکامل و ناپاک ہمیشہ المناک۔ واجب است کہ ایں جوہر علوی را بدرجۂ عقول رسانی تا بعد انقطاع تصرفش در الم نمانی۔ شام نزدیک بود زمدیانے در راہ انداختہ رواں شد و بگورستان سواد شہر کہ دراں بسر میکرد نہاں گشت شنیدم کہ ہماں شب در مہتاب از جوش دیوانگی چرخ زناں میگشت۔ قضارا پایش بسنگ مزارے آمد و شکست۔ و

پیش از شکستن شب رخت ہستی بربست۔ دیوانہ عجیبے بود ذوفنون انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حکایت

اسد دیوانہ۔ ساکن ویرانہ۔ سالک مجذوب۔ درویش خوب۔ رند بوریا
پوش۔ چوں بحر در جوش۔ بر تالاب فیروز خاں کہ مشہور باگیر شکستہ بود در اشجار سر بہم
آوردہ تکیہ بکمال پاکیزگی و صفا داشت۔ اکثر رندان با غایتِ در آفتاب گرم آنجا رفتہ
می آسودند۔ و پیش خدمتان آں دل از دنیا برداشتہ ہمیں ایشاں بودند۔ روزے
شنیدم کہ در تکیہ او بوریا کوبی است و یاران در مسجدے کہ ساختہ بود سرگرم پاکوبی۔ رفتم
و دیدم درمیان ہمہ نشستہ۔ زنگ و زنجیر بر کمر بستہ۔ وارستہ مستغنی الحال نیم زباں
تمام کمال۔ اگرچہ در ظاہر جامہ بر تن نداشت۔ اما دامن پہلو وار او کس نگذاشت۔
شہرے برائے او سر بصحرا۔ او در کلبۂ احزان خود تنہا پشت بکوہ بودن او مشہور۔ اما
پاس خاطر گاہے منظور۔ چنانچہ مرادید و پرسید۔ چوں شام شد طعام آوردند۔ دست
از دنیا شستگاں باہم خوردند۔

بعد خوردن طعام جوگئے ناتھ نام تائے پیراہن در بر۔ زنجیر قلندرانہ بر سر۔
تاسے خوان بر کف دست پیش فقیر آمد و نشست۔ درویش چناں بمزاج گوئی پرداخت
کہ آں ہمہ وحشت را مانوس ساخت۔ وقتے کہ سخن از ہر باب بر زباں آمد و ذکر حشر
اجساد درمیان آمد۔ جوگی کہ بسیار بر مسائل معاد گشتہ بود۔ و فقیران نام ہمین شدہ
را خدمت نمود سر کرد۔ کہ در اثبات بعث و حشر دلایل بسیار است۔ اما عود نفس بہاں

بدن دشوار است۔ مثلاً آدمی مرد و خاکش ہمہ خورد۔ و پس از روزگار طویل اجزاے ارضی بہ نبات مستحیل۔ نبات غذاے حیوان شد و حیوان غذاے انسان۔ اگر ہمت بحشر بگمارند بہ کدام صورت باز آرند۔ معہذا نفوس مفارقہ را غایت نیست و ابدان و مادّہ را نہایت۔ اگر حشر کنند و بقسمت مواد گرانید نفوس از مواد البتہ بیشتر آنید۔ گفت کہ ہیچمدانم اما ایں قدر میدانم کہ حقیقت جان آدم قدیم است بذات خویشتن و گفتگوے قالب در اینجا بر قالب زدن۔ گماں مبر کہ معنی مرگ نیستی جان عزیز است ایں انقطاع تصرف آو از قالب ناچیز است معنی بعث و حشر نہ آں باشد کہ جان را قالب ہما باشد۔ قالب مرکبے بیش نیست از بدل آں چہ زیان است۔ رو و بدل یابو است سوار خود ہمان است۔ کسانیکہ قالب اول شرط میکنند ترہات میگویند و ژنخ میزنند

برخورد و نخست بود رخصت خواستیم۔ من و جوگی باہم برخاستیم۔ روزے اتفاق دیدن آں ہشیار سر باز افتاد۔ دیدم کہ با ہماں جوگی گرم صحبت است۔ و میگوید کہ اے عزیز دل را بدلبرے دادہ ام کہ دیدنش باین نظر میسر نمیشود و دل بقرار از بدگمانی بسیار ہر دم بصد جا میرود۔ ہر فرد از افراد انسانیش خداے من میگوید۔ ہر بے سر و پا نشان او در خود میدہد۔ حیرانم کہ آں چہ خصوصیت است۔ نمیدانم کہ ایں چہ معیت است۔ من کہ دل بر ہلاک خود نہادہ ام۔ و بایں خرابی در خرابہ افتادہ ام۔ روز و شب در تابم ہیچ درنمی یابم۔ اگر فی الجملہ آگاہی داری بر خود مپیچ شوق شوق است اینجا و دیگر ہیچ۔ ــہ

می کنم آنچہ شوق می گوید		منقرض بسا نباید بود

اگر شوق در حد کمال است عاشق بمنزل وصال است۔ ہر قدر در قصور ہماں قدر راہ دور شوق کامل بکام دل میرساند۔ عاشق را معشوق میگرداند۔ کمال انسان معرفت است و کمال معرفت حیرت۔ اگرچہ ازاں کمالات اوئی خوشاحال در اِنہ نہ کار میگوئی عین وبال بشنو دنیا را جہان گذران میگوئید اینجا دامن بمیاں برزدہ باید بود یعنی ایں منزل نیست راہ است۔ قافلہ قافلہ می روند۔ فکر زاد باید نمود۔

تا یکے گوئی ز دنیا بگذرم		چوں جرس با ید سخن در راہ گفت

فقیرے ہمیشہ قصر نماز میکرد۔ شخصے گفت کہ قصر در سفر است نہ در وطن۔ گفتا ہر نفس و ہر آن از مرتبۂ خود میروم۔ وچوں آب باریک زماں زماں تلف می شوم

جائے کہ چوں نماز سفر عمر کوتہ است		بیجا بود کہ فکر اقامت کند کسے

یکے بعد نماز شام بجرأت تمام باو گفتم کہ اے درویش ایں جگر ریش از روزے کہ بہشت و دوزخ روحانی را شنیدہ است خار خارے دارد یعنی ہیچ بہ فہمید من نہ می آید۔ اگر بیان نمائی احسان بہشت کنی۔ گفت کہ اے جوان بہشت و دوزخ کہ قالب دراں شریک ست متعارف است۔ حاصل یکے حور و قصور و انہار و اشجار حاصل دیگرے زہر و زقوم و نار و مار۔ اما بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذت و الم جانی۔ حاصل آں دریافت معقولات و مشاہدۂ آں ماہ تمام۔ حاصل ایں شرم و خجالت و سوختگی و آلام۔ حکما میگوئید نفس را بعد موت لذت عظیمے است کہ لب بوصف او

نتواں کشاد۔ یا درالم ایسے است کہ شرح آں نتواں داد۔ اشارت بہمیں و حال است
نفوس کاملہ را لذت دوام ناقصہ را رنج والم مدام۔

یکے بر من التفات بسیار کردہ گفت کہ اے جوان از انداز تو در می یابم کہ سر
درویشی داری۔ بیا ازیں خیال درگذر۔ گام اولیں فقیری در ہلاک خود کوشید نست
یعنی پیشتر از مرگ طبعی جان سپردن۔ ایں را جگرے می باید۔ گام دومیں خود را ندیدن
یعنی با گذشت بسر بردن و خود را چشم نیاوردن۔ ایں از دست کسے نمی آید۔ قطع
ایں دو قدم راہ مشکل است۔ زیرا کہ ہر نفس کار با دل است۔

روزے نشستہ بودم کہ گفت اے جوان دوش واقعہ دیدہ ام کہ مشعر بر
واقعہ من است۔ می بینم کہ مرا پیر در بغل میکشد۔ و شکایت جدائی میکند۔ غالب کہ
خناے عشرت زندگانی بر سر ناخن رسید۔ گفتم خدا ترا صد سال سلامت دارا د خواب
خیال ست دل براں نباید نہاد۔ در ہماں ہفتہ گوش زد شد کہ بسرسام مبتلا گشت۔
وازیں جہان گذراں درگذشت۔ مرد خوشے بود خداش بیامرزاد۔

حکایت

ہرگاہ روزگار نا سازگار بد باخت۔ و مرا از اکبر آباد آوارہ ساخت۔ رخت
خود بہ شاہجہان آباد دہلی کشیدم۔ اینجا بخدمت شریف میاں سعید خاں رسیدم او
مردے بود کامل۔ ہمہ تن دست و دل۔ بالا بلند۔ دقت پسند۔ گرم جوش۔ سراپا ہوش

چپیاں اختلاط۔ خوش ارتباط۔ وضع مربوط۔ حال مضبوط۔ دل بایار۔ دست
درکار۔ قایم اللیل صایم النهار۔ دست از دہش باز نداشتے۔ مدار بر توکل گذاشتے
سیر چشم تمام حیا۔ گرسنه دل نام خدا۔ هر جا خسته جانے میدید سر زخمش میمالید۔ گوش
بر صدائے گدا بودے۔ گوشداری عاجزاں نمودے۔ رو از دنیا برتافته۔ عارف قرار
یافته۔ قلندر رمو شروم۔ کفت و قدم همره هم۔ چادر بر دوش۔ بایک ستر پوش۔ پا
بے کفش سر عریاں۔ گاہے خنداں گاہے گریاں۔ اکثر در مجلسهاے شیخان شهر رفت
و پائین می نشست۔ عزیزاں بسکه پاس او میکردند رفته رفته صف نعال صدر میشد
با بسران نوخط ربط بهم رسانیدے۔ در برزن و بازار چشم چرانیدے۔ پاس خاطر کس
مینمود۔ یک بزرگ کو چاپ بود۔ شاه و وزیر جویاے ملاقات۔ او بسیار کم التفات
طرز خاصیش وادن نان۔ دشمن و دوست هر دو مهمان۔ بخت بلندے۔ داشت
امیراں زر لکے میدادند و منت بر خویش می نهادند۔ یکے چهل هزار روپیه از وزیر
گرفت و حوض شکسته قدم شریف را که آب می انداخت مرمت کرد۔ وزر بقیه بر فقرا
و غربا و ابن السبیل قسمت۔

چوں عمر به پنجاه رسید پاے بدامن کشید۔ هر روز بعد نماز صبح بگورستان میرفت
و قریب نیم روز می آمد۔ یکے دنبالش گرفته رواں شدم۔ دیدم که بر سر هر گور نظر عبرت
میکند و پیش می رود۔ ناگاه آواز پاے من بگوش رسید۔ رو پس کرده بخشونت گفت
که اختلاط زیاده بر آشنائی مرا خوش نمی آید۔ چناں خوف بر من غالب آمد که دیگر طاقت

برداشتن پا نماند۔ وقتے کہ عین شدمی بینم کہ چیزے بچادر خود بستہ می آرد پیش رفتم و پرسیدم کہ چہ آوردہ۔ گفت قدرے شیرینی برائے عجوزشکستہ پاے کہ دریں محلہ تلخکامی تمام چوں سرنشینان بخاک افتادہ بدہ بدہ میکند فرستادہ اند۔ بیاکہ اورا بخورانم۔ رفتم وہماں حالے کہ گفتہ بود پیرزنے را بر سر راہ معائنہ کردم۔ برابر روئے او رفتہ گفت کہ برخیزد شیرینی بخور۔ آں ضعیفہ از مدت مدید نام شیرینی نشنیدہ بود تا بخوردن چہ رسد۔ مضطرب الحال سر از خاک برداشت۔ درویش ہمہ را پیش رویش گذاشت۔ او شکم سیر خورد و بخفت۔ ایں رد من آورد و بگفت۔ ع

راحت بدل رساں کہ ہمیں منزل ست و بس

روزے سگے در بازار از فرط جوع بر استخوان خشک دنداں میزد۔ ناگاہ ریزۂ استخواں بجاے دندانش خلید و خوں برآمد۔ چوں چاشنی در بن دنداں افتاد شدت گرسنگی فریبش داد یعنی سگ گمان برد کہ ایں خون از استخوان می آید بدنداں خائیدن گرفت۔ درویش ایں حالت اضطراری دیدہ مضطرب شد۔ نخنشو دراں حال از دکان نان بانان و شوربا گرفتہ میرفت۔ دید و با و گفت دیریست کہ من و تو ہم محلہ ایم۔ اما تا امروز حاجت وائی من نکردہ۔ اگر دست ازیں نان و شوربا برداری منتہاے بحیلہ بر من گذاری۔ او از حالش خبر بود۔ گفت بلا گرد انت شوم جان کہ در دنیا بسیار عزیز است اگر بخواستی مضائقہ نمیکردم نان و شوربا چہ چیز است۔ حاصل کہ از و گرفتہ پیش سگ برد و آں سگ بے طاقت ہمگی خورد۔ آرے کسانیکہ ایں ہے بدل و ارند دل سگ را نیز بدست می آرند۔

یکے برادر گرامی قدر محمد حسین کلیم تخلص شکایت کرد کہ از بے روزگاری جامہ بر تن ندارم۔ آخر من ہم از پیش دامنام گاہے مراعات گوشۂ یا بکسے اشارہ کہ زندہ خود بمانم۔ گفتا شکوہ مراعات بجاست لیکن مرا اختیار کجاست — ع

این دست من آستین دست دگر است

ونیکہ میگوئی یکبے بنگوئی موقوف بر وقت بود۔ رفت و ہمان شب بخواب دید کہ درویش با مرزا محمد علی برادر خورد اسحاق خان شہید برائے نوکری من گفت و او قبول نمود پس از دو سہ روز نوکر چہل یا پنجاہ روپیہ و شدہ آمد و آن معاملہ را بیان نمود۔ گفتا اضغاث احلام اعتبار ندارد۔ الحمد للہ کہ کامیاب شدی۔

باآنکہ محو یاد الٰہی میبود اما ربط درستے بہ شعر و شاعری داشت۔ یکے دم صبح مرا خواست چون حاضر شدم گفت کہ خفقان بشدت دارم و اشدے نمیشود شعرہائے عاشقانہ بخوان کہ زار بگریم۔ اتفاقاً این شعر از زبان من بر آمد ؎

صبر بہ پیش دل نو شکیب من باشد — کہ از برائے طپیدن بہانہ مے طلبد

دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردمان بدو دستش برداشتہ اندرون خانہ بردند ازان باز بیرون نیامد۔ دو سہ روز حال عجبے داشت۔ گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر درگذشت خدائے کریمش بیامرزاد و غریق بحر رحمت گرداناد۔

نحمدہ و نشکرہ کہ رسالہ مسمیٰ بہ **فیض میر** تمام شد۔ امید از یاران زمان آنست کہ اگر جائے عیب و خطا ملاحظہ نمایند نظر بر وقت تنگ و فرصت کم من نمودہ زبان طعن نہ کشایند۔ چہ شد کہ اخوان معانی را در پیم اما بہ بندایں کار دشوار نیم۔

پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۲۹ء

DUE DATE

Date	No.	Date	No.